دل کی دنیا
مع تجزیہ
عصمت چغتائی

١

عصمت چغتائی

دِل کی دُنیا

مع تجزیہ

ڈاکٹر شریف احمد

ساقی بک ڈپو، دھلی

○

اپنے قلم کی ایک جنبش سے سو سو جادو جگانے والی مشہور افسانہ نگار عصمت چغتائی نے اس ناولٹ میں سماج کی فرسودہ روایات سے آزاد ہو کر "دل کی دنیا" آباد کی ہے۔ دل کی دنیا بظاہر چھوٹی سی دنیا ہے، مگر اس میں اَن گنت محشر بپا ہیں۔۔۔ یہ ایک ایسی دوشیزہ کی کہانی ہے جسے شادی کے بعد شوہر نے چھوڑ دیا تھا، جسے مذہب اور اس سے زیادہ سماج کی غلط روایتوں اور خاندانی قدروں کے درمیان راستہ نہ سوجھتا تھا۔ لیکن جس نے اپنے ہی جیسی ایک بد نصیب زندگی سے تحریک پا کر اپنے چاروں طرف روشنی کا ہالہ بُن لیا۔

عصمت چغتائی نے یہ ناولٹ نہیں بلکہ ایک حسین شعر تخلیق کیا ہے۔

ڈاکٹر شریف احمد (سابق ریڈر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) نے اس ناولٹ کا تجزیہ تحریر کیا ہے۔ موصوف نہ صرف اردو افسانوی ادب بلکہ انگریزی فکشن پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ درس و تدریس سے طویل وابستگی کے باعث انھوں نے سینکڑوں ذہنوں کی آبیاری اور کردار سازی کی ہے۔ ان کے تجزیہ سے ناولٹ کی معنوی تہہ داریوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

(ناشر)

ڈاکٹر شریف احمد
سابق ریڈر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

"دِل کی دُنیا"
ایک تجزیہ

عصمت چغتائی اردو فکشن کی بڑی نمایاں اور ممتاز فنکار ہیں۔ انہیں ناول، افسانے، ڈرامے، خاکے، انشائیے اور مضامین لکھتے ہوئے چار دہائیوں سے زیادہ کا عرصہ میسر آیا۔ اس طویل عرصے میں ان کی مقبولیت اور شہرت نے بڑے نشیب و فراز دیکھے۔

ان کی تصنیفی زندگی کی ابتداء میں پڑھے لکھے طبقہ نے یہ مشہور کر دیا کہ کوئی ہندوستانی مسلمان عورت ایسے بے باک، واشگاف، اور مخرب اخلاق افسانے نہیں لکھ سکتی۔ ہو نہ ہو، عصمت چغتائی کے پردے میں ان کے بھائی، عظیم بیگ چغتائی ہیں، یا کوئی اور "چغتائی"۔ لیکن جب ان کا جرأت مند قلم نت نئے اور چونکا دینے والے افسانے مسلسل تراشتا رہا اور انہوں نے کبھی کبھار ادبی نشستوں میں آمد و رفت شروع کی، اور اپنے افسانوں کے حسن و قبح اور طعن و تعریض کا خود جواب دیا تو، شک و شبہ کا یہ غبار چھٹ گیا، کہ ان کے پردے میں کوئی اور لکھتا ہے۔

اس میں شک نہیں، کہ ان کی ابتدائی تخالیق ہماری سماجی زندگی کے نئے پہلوؤں کی اتنی نقاب کشائی نہیں کرتی تھیں، جتنی کہ مبہوت و متحیر کرنے کی سعی۔ مبہوت و متحیر کرنے کے لئے انہوں نے سعادت حسن منٹو کے مانند جنسی اخلاقیات کا انتخاب کیا تھا۔ اس بابِ خاص میں، ان پر ڈی، ایچ، لارنس کا اثر ہو یا نہ ہو، لیکن منٹو کا اثر ضرور تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارا سماج جنسی منافقت کا پہلے بھی شکار تھا اور آج بھی ہے۔ اور جنسی تعلقات کے حوالے ادب میں کوئی نئی چیز ہرگز نہیں ہیں۔ لیکن انسانی تعلقات کا یہ رقبۂ زمین بہت پھسلواں ہے۔ اس سے بسلامتی گذر جانا، ہر فنکار کے لئے ممکن نہیں۔ نہ جانے کتنے پختہ کار یہاں آکر ایسے گرے کہ بہت جلد نہ صرف ناقدین، بلکہ قارئین نے بھی انہیں ہمیشہ کے لئے فراموش کر دیا۔

جو فنکار ایسے موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے، وہ چیخوف کے مطابق ایک ڈاکٹر کی طرح ہوتا ہے۔ جس طرح مریض کے جسم کا کوئی حصہ ڈاکٹر سے نہیں چھپایا جا سکتا، اسی طرح ایک ادبی فنکار کی نظر بھی انسانی جسم (اور روح) کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ اگر ڈاکٹر انسانی جسم کے کسی حصّے کو دیکھ کر تلذّذ محسوس کرنے لگتا ہے تو پھر وہ ڈاکٹر کے منصب سے گر جاتا ہے۔ بعینہٖ اگر فنکار کی نظریں انسانی جسم کے بعض اعضاء پر رک کر رہ جائیں اور وہ کوئی معنی خیز بات کہنے کے بجائے لذّت انگیزی اور لذّت آموزی میں مبتلاء ہو جائے، تو اپنے فن کی عظمت اور تقدیس سے گر جائے گا۔

''لحاف'' اور اس قبیل کے افسانے عصمت نے شروع میں ضرور

لکھے، لیکن رفتہ رفتہ ان کی قوتِ مشاہدہ اس تنگنائے سے نکل کر انسانی زندگی اور اس کے بے کنار تعلقات کے میدانوں کا جائزہ لینے لگی۔ جنسی تعلقات کے بیانات اب ان کے افسانوں اور ناولوں میں زیادہ مناسب اور معتدل طریق پر آنے لگے۔ انہوں نے اردو ادب کو کئی خوبصورت افسانوں کے مجموعے اور ایک نہایت اہم ناول ''ٹیڑھی لکیر'' دیا۔ ''دوزخی'' لکھ کر انہوں نے اردو خاکہ نگاری کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اگرچہ اس میں ان کے پڑھنے والوں نے، ذہین پڑھنے والوں میں ہر ایک نے، ان کی سنگینی، بے رحمی اور روایات و اقدار کی توڑ پھوڑ دیکھی۔ لیکن ان کے پڑھنے والوں میں، ذہین پڑھنے والوں میں، ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہ تھی جنہوں نے سنگینی، بے رحمی اور اقدار شکنی کے نیچے انتہائی ترحم، دردمندی اور انسان دوستی کی لہر کو محسوس کیا۔ ان کے ڈرامے بڑے ڈرامے نہ سہی، لیکن اردو ڈرامے کی تاریخ میں نظر انداز بھی نہیں کئے جا سکتے۔ ان کے متعدد ناولٹ بھی اپنی تازہ کاری اور تازہ خیالی کے باعث پڑھے جاتے رہیں گے۔ لیکن ''دل کی دنیا'' ان کے سب ہی ناولٹ میں سب سے زیادہ وقیع اور فنی اعتبار سے ترشا ترشایا ہے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ اس ناولٹ کی اشاعت کے بعد ادب کی جانچ اور پرکھ کرنے والوں نے اس پر کوئی توجہ نہ کی ہو۔ لیکن ایسا ضرور ہے کہ اس پر سیر حاصل گفتگو اب تک نہیں کی گئی۔ چھوٹے کتابی سائز کے ایک سو اٹھائیس صفحات[1] پر پھیلا ہوا یہ ناولٹ اپنی چند در چند خصوصیات کی بناء پر عصمت کی تحریروں میں ''ٹیڑھی

---

[1] ''دل کی دنیا'' کا پہلا ایڈیشن پاکٹ بک سائز میں شائع ہوا تھا۔ (ناشر)

لکیر'' سے پہلو مار تا ہے۔ مندرجہ ذیل سطور شاید اس کے ادبی قامت کا تعین کرا سکیں۔

''دل کی دنیا'' کی کہانی ہر گز چونکا دینے والی نہیں ہے۔ بلکہ بڑی حد تک نارمل، عامتہ الورود، جانی پہچانی اور سنی سنائی ہے۔ لیکن عصمت کے مشاق، آزمودہ کار اور خلاق قلم نے اسے غیر معمولی بنادیا ہے۔ اس ناولچے کو عصمت کا قاری اگر چاہے تو ایک ہی نشست میں ختم کر سکتا ہے .... تین گھنٹے سے لے کر چار گھنٹے تک۔ لیکن یہ مختصر ساوقفہ، کہا جاسکتا ہے، اسے دلچسپی، استغراق انگیز دلچسپی، انہماک، فکر انگیز انہماک اور انسانی زندگی اور رشتوں کے حسن، تعمق اور ان سے پیدا ہونے والی بصیرت فراہم کرتا ہے۔

کہانی بس اتنی سی ہے: پہلی عالمی جنگ کے بعد برطانوی ہند کے ایک صوبے، یوپی کے شہر بہرائچ کے ایک مسلمان خوشحال خاندان میں ایک دھماکہ ہوتا ہے۔ دھماکے سے پہلے یہ خاندان اور دوسرے ہندو مسلمان خاندانوں کی طرح رسمی اور روایتی اخلاق اور مذہب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ دھماکے کے بعد ان میں سے ایک میں بڑی پرانی اور پکی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے: (اور اسے پلاٹ بھی کہا جا سکتا ہے) بہرائچ میں سپہ سالار غازی کی درگاہ کے سامنے ایک دو منزلہ کوٹھی میں ایک مسلمان سرکاری عہدیدار اقامت گزیں ہے۔ بھرا پرا خاندان ہے، بیوی،

اولاد، ماں، خوشدامن اور قریب و بعید کے عزیز و اقارب اس طرح زندگی گذار رہے ہیں کہ جیسے دنیا کا کوئی غم ان کے حصے میں نہیں آیا۔ قدسیہ بانو صاحبِ خانہ کی چشم و چراغ ہے۔ قبول صورت، حساس، ذمے دار، شائستہ۔ قدسیہ کی عمر پچیس چھبیس سال کی ہے۔ یوں ان کی شادی دس سال پہلے ہی خاندان ہی کے ایک فرد باقر حسین سے ہوئی تھی، جو کتخدائی کے چھ ہی مہینے بعد انگلستان بھیج دیئے گئے تھے۔ (اس لئے کہ شادی کی شرط ہی یہی تھی۔) شروع میں باقر حسین اور قدسیہ کے درمیان بڑی پر شوق اور پر خروش خط و کتابت رہی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ نہ شوق باقی رہا نہ خروش۔ اور اس کے بعد سلسلۂ خط و کتابت باقر کی طرف سے ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ قدسیہ ایک وفادار اور باعصمت بیوی کی طرح انتظار کی گھڑیاں گنتی رہی۔ اور جب انتظار ختم ہوا تو باقر ہندوستان واپس آئے، لیکن اپنے ساتھ ایک عدد میم بھی لٹکا لائے۔ انہوں نے مین پوری میں وکالت شروع کی اور وہیں، قدسیہ کو مکمل نظر انداز کر کے، رہنا شروع کر دیا۔ قدسیہ اور باقر کی یکجائی کی تمام تدابیر ناکام ہو گئیں۔ خاندان کے بزرگ یہ سوچ کر صبر کر گئے کہ قدسیہ بہر حال سہاگن تو ہے۔ ولایت میں تعلیم یافتہ ایسے بڑے آدمی کی برائے نام سہی، بیوی تو ہے...... جس کی ایک بیوی فرنگن بھی ہے۔

قدسیہ نہ جانے کب تک اپنے جذبات اور ارمان، حسرت اور امنگوں پر بندھ لگائے رکھتی کہ عرفِ عام میں ایک پاگل، آسیب زدہ، آوارہ گرد عورت اس کی زندگی کے رکے ہوئے اور متعفن پانی میں ایک بہت بڑے پتھر کی طرح آپڑی

اور اس چھپاکے اور دھماکے سے جو تموّج پیدا ہوا اس سے رکا ہوا پانی خاندان کی دیواروں کو توڑ کر باہر نکل گیا.......... قدسیہ سے سال دو سال بڑی بُوا کوئی ایسی گئی گذری عورت نہ تھی۔ مشہور تھا کہ چند سال پہلے اس کے باعزت ماں باپ نے اس کی شادی بھی اسی طرح کی تھی، جیسی کہ باعزت خاندان میں ہوا کرتی ہے۔ لیکن شادی کے بعد جب بارات دریا پار کر رہی تھی تو بیچ دریا میں ایک طوفان اٹھا۔ بچنے والوں میں صرف ایک بُوا تھی اور اسے بھی سالار مسعود غازی بچا سکے تھے......... تین دن تک بُوا کا کشتی کے ایک تختے سے چمٹا رہنا، سالار غازی ہی کا معجزہ سمجھا جاتا تھا.......... خاندان کی تباہی کے بعد اب بُوا بالے میاں (سالار غازی کی) چہیتی بیوی بن گئی تھیں۔ اس کی حرکات و سکنات، رفتار و گفتار دیکھ کر، بستی کے سب ہی لوگوں نے اسے بالے میاں کی سہاگن سمجھ لیا تھا۔ بُوا کے لئے اب کوئی روک ٹوک اور پابندی نہ تھی۔ وہ جہاں چاہتی جاتی اور جو چاہتی کرتی۔ دن رات کے گھومنے، صاف ستھرے لباس، پھولوں سے محبت اور بالے میاں کے لئے عشقیہ گیتوں نے اس کی شخصیت کو انتہائی پر اسرار بنا دیا تھا۔ قدسیہ اور اس کا خاندان بھی بُوا کی شخصیت سے بیگانہ نہیں تھا۔ کچھ ہی دن بعد بُوا کا آنا جانا اس خاندان میں بھی خوب ہو گیا...... قدسیہ کے ایک عزیز...... مستقیم...... کی سوچ یوں بھی خاندان سے مختلف تھی۔ وہ بُوا کو مجذوب نہیں...... لفنگی...... سمجھتے تھے۔ ایک دوسرے عزیز شبیر کی رائے بُوا کے متعلق وہی تھی، جو سب لوگوں کی تھی۔ مستقیم کی زندگی لہو و لعب میں گذری تھی۔ انہوں نے اپنا تمام اثاثہ شاہد و شراب کی نذر کر دیا تھا۔ وہ ایک دنیا دیکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بہت جلد یہ بھی

دیکھ لیا کہ شبیر قدسیہ کو صرف شعر و ادب کا درس دینے ہی نہیں آتے، بلکہ درسِ محبت بھی دیتے ہیں۔ قدسیہ اور شبیر کی باہمی وابستگی دیکھ کر انہوں نے اپنے اس جذبۂ محبت کا گلا گھونٹ دیا جو قدسیہ کے لئے اٹھا تھا۔

قدسیہ اپنا اور بُوا کا مقابلہ کرتی۔ ایک طرف رسم و رواج اور سماج کا ڈر۔ مجبوری اور معذوری۔ اور دوسری طرف مکمل آزادی، ہنسی خوشی، مسرت اور شادمانی.......... لیکن خاندان کی بزرگ عورتیں بُوا کی مہکتی ہوئی زندگی کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہ کر سکیں۔ انہوں نے بُوا کی ہیئت کو کسی جسمانی یا ذہنی مرض پر محمول کیا۔ خاندان کے ایک "حکیم صاحب قبلہ" کو رجوع کیا گیا۔ اور انہوں نے تشخیص کیا کہ بُوا کو علاوہ غیر معمولی حدت کے اور کوئی مرض نہیں ہے۔ حدت کے ابخارات اس کے دماغ تک پہنچ چکے ہیں۔ اور اس لئے وہ آسیب زدہ کی طرح ہو گئی ہے۔ بُوا اگر چہ کسی طرح حکیم صاحب کی تجویز کردہ دوائی لینے کو آمادہ نہ تھی، لیکن جب ظاہریت سے کام نہ چلا تو پوشیدہ طور پر، اس کے حلق میں حکیم صاحب کی گولیاں اتار ہی دی گئیں۔ املتاس کا لعوق اس نے پھینک دیا لیکن پان مین بند گولیوں کو وہ نہ دیکھ سکی اور نتیجہ؟ دن رات کے مسلسل جلاب اور ان سے پیدا ہونے والی نقاہت...... اب بُوا وہ پہلی سی عورت ہی نہ رہی۔ چند ہی دن کے بعد وہ پلنگ سے لگ گئی۔ کھلے میدانوں، جنگلوں، تلیوں اور ویران مسجدوں کا دن رات گشت، تیل، پھلیل، سفید براق کپڑے، عشقیہ گیت، سب غائب ہو گئے۔ اور ایک دن وہ اپنے تنگ و تاریک کمرے میں ایک کھٹولے پر پڑی مردہ پائی گئی۔ یوں تو اس کی موت کا سب ہی پر اثر ہوا، لیکن قدسیہ پر بہت ہی

زیادہ اثر ہوا۔ بُوا کی موت نے جیسے قدسیہ کو نئی زندگی دے دی۔ قدسیہ کے مزاج میں اب خاموشی، برداشت، تحمل اور مفاہمت کی جگہ ضد، سرکشی اور بغاوت کی چنگاریاں بھر گئیں۔ کچھ خود اس نے اور اس سے زیادہ خاندان کے "ناکارہ" فرد، مستقیم نے اس پر بُوا کی حقیقت آشکارہ کر دی۔

بُوا کی موت نے اس بھید کو کھول دیا کہ بالے میاں اور ان کے ساتھ بُوا کی روحانی شادی محض ایک ٹٹی تھی، جس کی آڑ میں بُوا نے آزادی اور من چاہی زندگی گذارنے کی ایک تدبیر ڈھونڈ نکالی تھی۔ اس تدبیر کے بغیر دنیا والوں کا منھ ہرگز بند نہیں ہو سکتا تھا۔ بُوا کی موت میں اسے اپنا اور اپنے خاندان کا ہاتھ بھی نظر آیا۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نمائشی ضابطہ اخلاق میں بندھا سماج کسی کو اس کا حق اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک وہ خود آگے بڑھ کر چھین نہ لے۔

قدسیہ اور شبیر کی دل بستگی کا پتہ نہیں کیا انجام ہوتا، اگر مستقیم اپنی جراَتِ رندانہ سے کام نہ لیتے۔ انہوں نے چھپوّاں قدسیہ اور شبیر کو گھر سے فرار ہونے پر آمادہ کرنا چاہا...... لیکن محبت کے باوجود دونوں میں ہمت کی کمی تھی۔ پھر انہوں نے ایک اسکیم بنائی...... شبیر کی لائی ہوئی ایک کتاب میں ایک پرچہ رکھ دیا، جس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ اب فرار کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ قدسیہ نے فرار سے بہتر خودکشی کو سمجھا۔ اور رات کی تاریکی میں کوٹھی کے قریب باؤلی میں چھلانگ لگا دینی چاہی۔ مستقیم شبیر کو لئے پہلے سے وہاں موجود تھے۔ انہوں نے شبیر کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ قدسیہ کو وہاں سے لے کر رات کی تاریکی میں شہر سے باہر فرار ہو جائے...... اور ایسا ہی ہوا۔ فرار کے بعد خاندان کے بزرگ

لوگوں نے طرح طرح کی تاویلیں گھڑیں۔ عام تاویل یہ تھی کہ بُوا کے مر جانے کے بعد بالے میاں کا اثر قدسیہ پر آگیا تھا۔ اور انہیں کی ایماء پر قدسیہ نے باؤلی میں چھلانگ لگادی (اس لئے کہ قدسیہ کے نقوش قدم باؤلی تک پائے گئے اور اس کی جوتیاں بھی باؤلی کے قریب پڑی ملیں) اور عام خیال یہ بھی تھا کہ قدسیہ کے باؤلی میں گرنے کے بعد باؤلی کی تہہ میں ایک کھڑکی کھلی، قدسیہ اس کھڑکی سے ایک مرغزار میں پہنچ گئی، جہاں ایک مرصع تخت لئے کچھ نازنین .... حوریں تھیں...... جو اس کا انتظار کر رہی تھیں ...... جیسے ہی قدسیہ تخت پر بیٹھی، اسے اڑا لے گئیں۔ لیکن اصل حقیقت صرف مستقیم کو معلوم تھی، جسے انہوں نے اپنے سینے میں دفن کرلیا تھا۔ شبیر اور قدسیہ دلّی چلے گئے تھے، جہاں وہ برسوں لوگوں کی نظروں سے چھپے رہے۔ لیکن مستقیم کا رابطہ ان سے برابر قائم رہا۔ مستقیم نے ایک وکیل کے ذریعہ باقر حسین کو نوٹس دلوادیا کہ وہ قدسیہ کو طلاق دے دیں۔ باقر حسین نے نوٹس کی بات کسی کو نہ بتائی، لیکن طلاق سے صاف انکار کر دیا۔ انہیں دنوں سرکار نے خلع کا بل پاس کیا اور قدسیہ کی طرف سے باقر حسین کو طلاق دلوا کر قدسیہ کی شادی شبیر کے ساتھ کرادی گئی۔

اور یوں بیس سال گذر گئے۔

یہ پوری کہانی ضمیر متکلم (مصنفہ) کی زبان سے کہی گئی ہے، جو بیس سال پہلے نو دس برس کی بچی تھی، اور قدسیہ کو خالہ، شبیر کو ماموں اور مستقیم کو چچا کہتی تھی۔ بیس برس بعد مصنفہ بمبئی میں ہے اور اس کی دانست میں ہنوز قدسیہ پریوں کے تخت پر بہت پہلے اتار دی گئی ہے۔ اور ماموں شبیر برسوں پہلے لاپتہ

ہو گئے ہیں۔ شاید کہیں پر مر کھپ گئے ہیں۔ بیس برس بعد ایک نسوانی آواز مصنفہ کے ٹیلی فون کے رسیور میں گونجتی ہے...... رفیعہ حسن! مصنفہ کو اس کا کچھ علم نہیں، لیکن وہ اس کے اصرار پر اسے اسٹیشن سے اپنے گھر لے آتی ہے۔ رفیعہ حسن اسے بتاتی ہے کہ وہ شبیر اور قدسیہ کی بیٹی ہے۔ جو برسوں پہلے انگلستان میں جا بسے تھے اور اب وہ واپس انگلستان جا رہی ہے۔

"دل کی دنیا" کا یہ پلاٹ ہے جو سطور بالا میں بیان کیا گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ پلاٹ کی چستی، ارتباط اور گٹھاؤ کا صحیح اندازہ ناولٹ کو پڑھے بغیر نہیں ہو سکتا۔ تاہم یہ کہنا نامناسب نہ ہو گا کہ ناولٹ کا پلاٹ ایک ذہنی تنظیم و تشکیل کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک زنجیر ہے جس کی ایک کڑی دوسری کڑی سے ملی ہوئی ہے۔ کہیں کوئی کھانچا یا خلا یا عجب نہیں معلوم ہوتا۔ بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے۔ کہانی کہنے کا انداز اس قدر جاذبِ توجہ ہے کہ پورا ناولٹ ختم کئے بغیر نہیں رکھا جا سکتا۔ عصمت نے دو تین مقامات پر ڈرامائی انداز بھی پیدا کیا ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی چیز ٹھونسی ہوئی نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ ناولٹ کی اندرونی منطق کا تقاضہ یہ تھا کہ اسے قدسیہ اور شبیر کے فرار ہونے پر ہی ختم کر دیا جاتا...... بیس سال کے طویل وقفے کے بعد بمبئی میں رفیعہ حسن سے مصنفہ کا دفعتاً ملنا اور گذشتہ حالات بیان کرنا، ناولٹ کی روانی اور تاثر سے لگا نہیں کھاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ کو کہانی کا واضح انجام دکھانا مقصود تھا۔ ذہین قاری کے لئے کسی واضح انجام کی طرف اشارہ کرنا بہت ضروری نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ناولٹ میں شروع سے، اور قدسیہ و شبیر کے فرار ہو جانے تک،

مقصدیت فن کے حریری پردوں میں چھپی رہتی ہے۔ لیکن رفیعہ حسن سے ملاقات اور گفتگو ایک طرح کی کھلی نصیحت اور پند معلوم ہوتی ہے جو عصمت کا شعار نہیں۔

اس چھوٹے سے ناولٹ میں، کہانی، پلاٹ، کردار، مکالمہ، منظر، زبان و بیان اور نقطۂ نظر، سب آپس میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔

قدسیہ بانو، بوا، شبیر، مستقیم، اماں، دادی اور نانی سب ہی کردار اپنا کوئی نہ کوئی نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ لیکن ایسا نقش جو ذہن کے صفحہ پر مرتسم ہو جاتا ہے، بوا کا کردار ہے۔ یہ کردار ایک مخصوص فضا اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ گھر ہو یا گھر سے باہر، نگاہیں اسی پر مرکوز رہتی ہیں۔ عصمت نے اسے ایسی انفرادیت بخشی ہے جو "دل کی دنیا" کے کسی کردار میں نظر نہیں آتی...... بوا اس پراسرار فضا کو لئے ناولٹ میں اس طرح داخل ہوتی ہیں۔

> "ہم کلیاں چن رہے تھے، جھولیاں چھلک رہیں تھیں۔ مگر ہمیں صدر دروازے کے چوکور قندیل کے روشن ہونے کا انتظار تھا کہ یکایک وہ آواز بالکل ہماری پشت پر لہرائی۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہم نے چونک کر دیکھا وہ مسجد کے پچھواڑے پرانے قبرستان میں ٹوٹی پھوٹی قبروں کے درمیان آندھی میں گرے ہوئے ایک برگد کے تنے پر کچھ روٹھی سی بیٹھی تھی۔ وہ گاتے گاتے رک گئی۔ ہمارے پیر بھوسا بھری بوریوں کی طرح دھنسنے لگے۔

"چھوڑو ہمرا آنچل!" وہ اپنی پشت کی طرف مڑ کر کسی کو ڈانٹ رہی تھی۔

ہم گرتے پڑتے، بسورتے بھاگے۔

اس کا آنچل کوئی نہیں پکڑے تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔"

اس کے بول ہوں یا چال، دونوں پر ایک پراسرار کیفیت چھائی ہوتی ہے۔ چونکہ اس کا تعلق گاؤں سے پہلے اور قصبے سے بعد کو ہے۔ اس لئے وہ صرف اودھی میں بات کرتی ہیں۔ اودھی کے جملوں، فقروں اور گیتوں نے ان میں ایک مخصوص واقعیت اور اصلیت کا رنگ بھر دیا ہے۔

"سیاں توری گودی، پھل گیندوا بن جاؤں گی

بلما توری گودی.................

سیاں تورے نکھرے ہم نہ سہیں گے

ارے تو چڑھیو گھوڑا ہم ہاتھی چڑھیں گے

بلماں تورے نکھرے..................."

اور اس کا یہ جملہ: "میرٹھ میں ملیں گے دونوں جنے۔" تو کہانی کا تھیم سانگ بن گیا ہے۔ جو بار بار اور بہت مناسب موقعوں پر آتا ہے۔

اس نے اپنی دھج بھی غیر معمولی بنا رکھی ہے۔ نک سک سے درست، کلف دار گلابی دوپٹہ، آنچل میں طرح طرح کے پھول، کرتی اور سفید چنٹ دار پاجامہ۔ وہ جہاں سے گذرتی ہے اپنے پیچھے خوشبو کا طوفان چھوڑ جاتی ہے۔ بقول عصمت "بھینی بھینی تازہ کھدی ہوئی مٹی کی سی مہک آتی تھی۔"

چند اتفاقات اس کے "خدارسیدہ" ہونے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

وہ تو آبادی ہو یا ویرانہ، ہرنی کی طرح کلیلیں بھرتی پھرتی تھیں۔ کسی منچلے نے ایک بار ان کے ہاتھ کو بری نیت سے کھینچا۔ انجام یہ ہوا کہ کچھ ہی دن بعد اس کا ہاتھ سڑ گل کر علاحدہ ہو گیا۔ کسی پہلوان نے ان کو ایک بار دبوچنا چاہا۔ بہت دن نہ ہوئے کہ پہلوان کسی بیماری میں مبتلاء ہو کر ایڑیاں رگڑتا ہوا مرا۔

قدسیہ کی کوٹھی میں، حکیم صاحب کی گولیاں کھانے سے پہلے، جتنی دیر تک وہ رہتی ہے۔ ایک دلچسپ ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ سماج کے ساتھ اس کا عمل اور رد عمل واقعی ایسا ہے کہ مصنفہ کے یہ بیانات صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

"وہ ایک کمزور عورت ہوتے ہوئے بھی، اپاج اور مجبور نہیں تھی۔"

"عورت ہو کر وہ مرد کے حقوق دابے بیٹھی تھی۔"

"اس کی موت بھی ایک معنی رکھتی ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض انسان مر کے دوسروں کو جینے کا سلیقہ سکھا جاتے ہیں۔"

قدسیہ کا کردار، جب تک اس میں خود آگہی پیدا نہیں ہوتی، تب تک سپاٹ اور بے رنگ رہتا ہے۔ لیکن اس کی انفعالیت، فعال کیفیت میں اس وقت بدلتی ہے جب اس کے اندرون میں ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ وہ سفید کو سفید اور سیاہ کو سیاہ کہنے کی جرأت پیدا کر لیتی ہے۔

نانی بیوی جب اسے شبیر کے ساتھ بے تکلف گفتگو کرنے پر دنیا کا ڈر اوادیتی ہیں تو تقدیر پر شاکر قدسیہ اس طرح کی بات کرتی ہے:

"جوتی پر واروں اس دنیا کو، دس برس سے جوانا مرگ مجھے رلا رہا ہے۔ اسے دنیا کچھ نہیں کہتی۔"

اور جب وہ شبّیر کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرنے سے باز نہیں آتی اور نانی بی اس سے برافروختہ ہو کر کہتی ہیں:

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے مردار۔"

تو قدسیہ جیسی نیک اور شریف عورت یوں جواب دیتی ہے:

"ہاں دماغ خراب نہ ہو گا تو اور کیا ہو گا۔ انسان ہوں، پتھر نہیں۔ پندرہ برس کی عمر میں مجھے بھاڑ میں جھونک دیا۔ سہاگ کی مہندی بھی پھیکی نہ پڑی تھی...... کہ سات سمندر پار چلا گیا...... وہاں اسے سفید ناگن ڈس گئی۔ پر یہ تو بتاؤ کہ میں نے کیا قصور کیا تھا۔ کسی سے دیدے لڑ گئے تھے۔ کسی سے یاری کی تھی؟"

اس کی بے زاری اور جھلاہٹ یہاں تک بڑھتی ہے کہ وہ مستقیم کی آڑی ترچھی لیکن تہہ دار باتوں پر خفا ہو کر اس پر ہاتھ چھوڑ دیتی ہے۔

"آج وہ چھ فٹ تین انچ کے دیو ہیکل مردوے کی جوتی کاری کر رہی ہے۔"

شبیر کا کردار شروع سے آخر تک دبا دبا اور بجھا بجھا سا ہے۔ لیکن ناولٹ کی فضا اسے ایسا ہی چاہتی ہے۔ مستقیم نے جب قدسیہ سے یہ کہا:

"عجب نخچو ہیں یہ تمہارے شبیر حسن۔"

تو شبیر کا پورا کردار اس میں سمو گیا ہے...... شبیر شروع ہی سے قدسیہ کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہے لیکن اس کے قریب بیٹھ کر نعتیں گاتا ہے۔یا پھر میر کے اشعار پڑھتا ہے۔اس میں اتنی ہمت نہیں کہ محبت کا ایک بول

بھی بول سکے۔ پھر عصمت نے اسے کچھ مضحکہ خیز بھی بنادیا ہے:۔

"پردہ ہٹااور شبیر ماموں غوطہ مار کر نمودار ہوئے۔"

اور پورے ناولٹ میں شبیر غوطہ مار مار ہی کر نمودار ہوتے ہیں۔ وہ کیا کرتے، ان کا قد ہی بے تکی حد تک لمبا تھا۔

بُوا کے کردار کا حریف اگر کوئی کردار ہے تو وہ چچا میاں (مستقیم) کا کردار ہے۔ یہ مانا کہ وہ نمبر ایک کائیاں ہیں۔ اپنے حلوے مانڈے کے لئے گھر کی دو پارٹیوں (سنیوں اور شیعوں) میں لڑائی کراتے ہیں۔

چچا میاں کا نام مستقیم تھا مگر پیار میں مچھو کہلاتے تھے۔ مستقیم کے معنی ہیں، سیدھا۔ مگر چچا میاں کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ انتہا سے زیادہ اینگے بینگے آدمی تھے۔ خاندان کے بزرگ لوگ انہیں "خدائی خوار" ہی نہیں بلکہ رنڈیوں کے ٹکڑوں پر پلنے والا "بھڑوا" تک کہتے تھے۔ لیکن مستقیم کے کردار میں بڑی جان اور آن بان ہے۔ اس کے ہر جملے سے اس کے جہاں دیدہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ تنہا آدمی ہے، جو حقیقت کو ستر پردوں میں دیکھ سکتا ہے۔ بُوا کے بہروپ کو وہ بڑی شگفتگی اور برجستگی کے ساتھ فاش کرتا ہے۔ اس کی باتوں پر کسی نے کان نہیں دھرا، اس کا کیا قصور۔ مستقیم اپنی آزاد روی اور تعیش کے باوجود شریف النفسی کا یہ ثبوت دیتا ہے کہ یہ معلوم ہونے پر کہ قدسیہ صرف شبیر سے محبت کرتی ہے، نہ صرف قدسیہ کی طرف بڑھنے سے باز آتا ہے بلکہ قدسیہ اور شبیر کے فرار کی اسکیم بھی بناتا ہے۔ اور دونوں کی شادی ہونے تک ہر طرح کے ایثار سے کام لیتا ہے۔

مستقیم کی صاف گوئی دریدہ دہنی تک پہنچی ہوئی ہے۔ بُوا کی جن باتوں اور واقعات کو لوگ اس کی غیب دانی پر محمول کرتے تھے، وہ انہیں صاف چٹکی پر اڑا دیتے تھے۔ جب ان کے سامنے بیان کیا گیا کہ ایک دفعہ کسی بد معاش نے بُوا کو اکیلا پاکر دبوچنا چاہا تو غازی بالے میاں نے اس زور کا لپڑ رسید کیا کہ اس کا تھوبڑا وہیں کا وہیں ٹیڑھا ہو گیا۔ ایک اور کم نصیب جو اُن سے الجھا اور جس ہاتھ سے ان کی کلائی پکڑی تھی، وہ سڑ گل کر گر گیا...... تو مستقیم کی دلیل یہ تھی۔

"درگاہ میں ہر سال ہزاروں کوڑھی شفا کی آس لگا کر آتے ہیں۔ ہاتھ پیر سڑ گل کر گر جانا معجزہ نہیں، بیماری ہے۔ اور شرابی کو لقوہ مار جانا بھی کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں۔"

یا جب ایک بار بُوا نے قدسیہ کے سامنے یہ گیت چھیڑا۔

"دھنا روئے روئے انکھیاں لال گال
پان پچاسی کے بیڑا لگائے
ہم سے نٹھور پیا اجھو نہ آئے
دھنا روئے روئے...... انکھیاں"

تو قدسیہ کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ حاضرین نے یہ سمجھ کر کہ بُوا غیب داں ہے۔ اس لئے انہوں نے ایک ہی نظر میں قدسیہ کی موجودہ محبت کو بھانپ لیا۔ بُوا کے پہونچے ہوئے ہونے کا اعتراف کر لیا۔ لیکن مستقیم کی رائے یہ تھی:

"کہیں سن چکی ہو گی۔"

ایک بار مولوی صاحب نے بوا سے کہیں کہہ دیا کہ یوں ماری ماری کیوں پھرتی ہو۔ شرع کرلو۔ بس پھر کیا تھا۔ ملاجی کا جوان بیٹا، باؤلی سے ڈول بھر کر مڑ رہا تھا کہ سانپ نے ڈس لیا۔ ملانی نے بوا کے تلوے چاٹے۔ جوتی پر ناک رگڑی تو لڑکے کی جان بچی۔

اس پر مستقیم کا کہنا تھا:

"پانی کا سانپ ہو گا۔ زہریلا نہیں ہوتا۔"

ناولٹ میں جہاں جہاں مستقیم نمودار ہوتے ہیں اپنی ذہانت و ذکاوت اور شوخی و بذلہ سنجی کے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔

نانی بیوی، دادی بی اور اماں کے کردار بھی جاذبِ توجہ اور دلچسپ ہیں۔ بالخصوص نانی بیوی اور دادی اماں کے درمیان سنیت اور شیعیت کی نوک جھونک، تفنن اور عبرت کا سامان فراہم کرتی ہے۔

عصمت کے قلم کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے قدسیہ کے شوہر باقر حسین اور قبلہ حکیم صاحب کو بہ نفس نفیس کہیں پیش نہیں کیا۔ ان کے متعلق دوسرے کرداروں سے چند باتیں کہلوائی ہیں۔ لیکن یہ چند باتیں اتنی تہہ دار اور معنی خیز ہیں کہ قاری کی نگاہِ تخیل ان دونوں کرداروں کو بھی دیکھ سکتی ہے۔

"دل کی دنیا" میں جتنے مصنفہ کے بیانات ہیں اتنے ہی مکالمات بھی ہیں۔ ان کے قلم سے نکلا ہوا کوئی مکالمہ بھرتی کا، زائد یا بے اثر نہیں کہا جا سکتا۔ یہ مکالمات اتنے اور ایسے ہیں، جن کو مقتبس کرنا، تحصیل لا حاصل ہے.........

مصنفہ کے بیانات کا ذکر ان کے اسلوب سے جا ملتا ہے۔ اور اردو فکشن کے

قارئین اچھی طرح جانتے ہیں کہ عصمت کا اسلوب ان کی شخصیت کا اظہار ہے۔
رچا ہوا، ترشا ہوا، البیلا، متنوع، برجستہ، پر اثر، دل نشیں اور انتہائی رواں دواں لفظوں کی تقلیل اور انتخاب اس کا خاص وصف ہے۔ وہ مختلف صورتِ حال اور موقعوں کے مطابق لفظوں کا استعمال کرتی ہیں۔ اور اس پر انہیں صنّاعانہ قدرت ہے۔ وہ ایک چابکدست مجسمہ ساز کی طرح چھینی اور ہتھوڑی کی مدد سے سنگلاخ چٹان کو تراش کر بُت بنا سکتی ہیں۔ ایک ماہر مصور کی مانند موئے قلم کی چند جنبشوں سے پوری تصویر مکمل کر سکتی ہیں۔ اور اس بابِ خاص میں اردو کا کوئی ناول نگار یا افسانہ نگار ان کے مقابل نہیں ٹھہر سکتا۔ انہوں نے سینکڑوں ایسے الفاظ کو ادب کی جمہوریہ میں داخل کر دیا ہے جنہیں استعمال کرنے سے پہلے دوسرے فنکار صرف سوچ کر رہ جاتے ہیں۔ اور ایسے تو سینکڑوں اور ہزاروں الفاظ ہیں جو یوپی کے مغربی اضلاع کے مسلمان متوسط گھرانوں سے نکل کر عصمت کے قلم کے لمس سے ادب میں داخلے کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔

مندرجہ ذیل اقتباسات سے ان کی قوت اظہار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

> "ادھر قوی قادر سے سفارشیں جاری تھیں کہ قدسیہ کے دولہا کو حاضر کرے مگر چلے، وظیفے اور دعائیں خلط ملط ہو گئیں۔ پالنا بھرا مگر میم کے وسیلے سے۔ جس دن سوتن کے یہاں بچی پیدا ہونے کی خبر ملی، قدسیہ خالہ اور بھی زمین دوز ہو گئیں۔ جیسے ان کی کچی قبر پر سنگ مرمر کا مزار کھڑا کر دیا گیا۔ اب تو روز حشر منکر نکیر کو ان میں جان ڈالتے ہوئے

آنکس آئے گی۔"

"وہ آخر بہت دور بے تعلق ہو کر بیٹھ جاتے۔ قدسیہ خالہ بھی انجان بنی بار بار دوپٹہ سنبھالتیں۔ وہ اور بھی مچلتا۔ گریبان کے سونے کے بٹن بوجھل ہو کر دھنسنے لگتے۔ اب انہیں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لئے آنکھیں استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی۔"

قدسیہ شبیر کی آنکھوں میں پہلی بار اپنی محبت کی چمک دیکھتی ہے۔ لیکن شبیر پھر بھی کوئی پیش رفت نہیں کرتے۔

اس تاثر کو عصمت داستانوی زبان میں یوں بیان کرتی ہیں:

'کالے دیو نے قدسیہ خالہ کی گردن کاٹ کے سرہانے کی چھڑی پائنتی اور پائنتی کی سرہانے رکھ دی تھی۔ ان کی گردن سے لعل ٹپک ٹپک کر شبیر ماموں کی جھولی میں گر رہے تھے۔ مگر وہ بے بس تھے کیونکہ دیو نے چھڑی گھما کر انہیں مکھی بنا دیا تھا۔ اگر ان میں اتنی سکت ہوتی اور وہ آگے بڑھ کے پائنتی کی چھڑی سرہانے رکھ دیتے تو قدسیہ کا کٹا ہوا سر فوراً جڑ جاتا۔"

ایک لینڈ اسکیپ بھی دیکھتے چلئے:

"بڑی اداس سی شام تھی۔ آسمان پر باریک سی گرد و غبار کی چادر تنی ہوئی تھی، ابابیلیں قینچیوں کی طرح ہوا کترتی ہوئی سپائے بھر رہی تھیں۔ عرس میں شرکت کرنے والے قوالوں کی ٹولیاں آنے لگیں تھیں۔ لمبے چوڑے شامیانے کی دن بھر مرمت ہوا کرتی۔

درگاہ تازہ قلعی کے بعد سفید براق ہو جاتی تھی۔ جیسے کسی نے بہت سا

سفید مارکین کھول کے اونچا نیچا ڈال دیا ہو۔

ان دنوں ہم گھر کو بھول کر درگاہ کے ہو رہتے۔ وعظ سے ہمیں رونا آنے لگتا تھا مگر قوالی میں خوب مزہ آتا۔

سراجاً منیرہ نگارِ مدینہ
تجلیٔ مکہ بہارِ مدینہ

مطلب خاک پلے نہ پڑتا، مگر مدینے کے ذکر سے ہم مرعوب ہو جاتے، پھر کسی اللہ والے کو حال آجاتا اور خوب اُدھم مچتی۔ قوال ایک ایک شعر پر اٹک جاتے اور وہی دہراتے جاتے۔ یہاں تک کہ بور ہو کر حال کھیلنے والا ست پڑ جاتا۔ اور قوال نیا قطعہ شروع کرتے۔"

جیسا کہ کہا گیا ناولٹ میں جگہ جگہ بڑے موثر ڈرامائی موڑ آتے ہیں۔ ایک اقتباس دیکھئے...... نانی بیوی اور قدسیہ میں خوب بحثا بحثی ہوتی ہے۔ نوک جھونک ہوتی ہے۔ نانی بیوی قدسیہ کی زبان درازی پر جوتی لے کر پل پڑتی ہیں۔ قدسیہ بھی آپے سے باہر ہو جاتی ہے، اور نانی بیوی پر ہاتھ چھوڑ بیٹھتی ہے۔ شور وشغب سن کر تمام گھر والے قدسیہ اور نانی بیوی کو نرغے میں لے لیتے ہیں۔ اور سب کی نگاہوں میں قدسیہ کے خلاف نفرت اور غصہ ہے، اس پر قدسیہ یوں احتجاج کرتی ہے:-

"خبردار جو کسی نے ہاتھ بھی لگایا۔ قرآن پاک کی قسم سر پھاڑ دوں گی۔"
قدسیہ خالہ نے سل کا بٹہ سر سے اونچا اٹھایا۔ سب کو اپنی جان پیاری تھی۔
سب ہائے توبہ مچاتی رہیں۔ آگے بڑھنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔

قدسیہ خالہ نے بہ عجلت کرپا بے پا شیشہ بورنا شروع کیا۔ اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھ ہونٹوں تک پہنچتے شبیر ماموں نے بڑے اطمینان سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

دس برس بعد کسی مرد نے انہیں ہاتھ لگایا۔ ان کے ہاتھ بے بس ہو کر نیچے گر گئے۔ مڑ کر انہوں نے شبیر حسن کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس وقت تو وہ بہشت بریں سے بھی لوٹ آتیں۔ آنکھیں موند کر وہ تیورا کر ان کے سینے پر گریں۔"

مندرجہ ذیل جملوں میں خط کشیدہ الفاظ ان کی مخصوص لفظیات پر دلالت کرتے ہیں:۔

پھر کسی نامعلوم سمت سے ایک وزنی دھموکا پڑا۔

"ترائی کے ادھر گاؤں میں شیر لگتا تھا۔"

"ہر وقت "ہوں ہوں" کا نکھتی رہتی تھیں۔"

"منہ تھوتھائے سب ایک دوسرے سے تنے رہتے۔"

"نانی بیوی، مر گئیں۔ پیر آئیں۔ انہوں نے دوا نہ پی۔"

"میرا کمرہ گمکا کے رکھ دیا ہے، ناک نہیں دی جاتی۔"

"قبر میں کیڑے بج بجائیں۔"

عصمت کی سب ہی تحریریں طنز کی زہرناکی اور ظرافت و مزاح کی مہتابیوں سے معمور ہیں۔ "دل کی دنیا" میں بھی طنز و مزاح کی ایک لہر شروع سے آخر تک دوڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے اسلوب کے اجزائے ترکیبی

میں شاید طنز و مزاح جزوِ اعظم ہے۔ ان کا طنز بے محابا اور بے پناہ ہوتا ہے۔ اور ان کا مزاح گرد و پیش کو تھوڑی دیر کے لئے منور کر دیتا ہے۔

اتنا کچھ کہنے کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ "دل کی دنیا" نہ صرف عصمت کے چھوٹے ناولوں میں نمایاں اور ممتاز ہے، بلکہ اردو کے اہم اور قابلِ ذکر چھوٹے ناولوں میں بہت سوں پر سبقت رکھتا ہے، تو بے جا نہ ہوگا۔

"دل کی دنیا" ناول تو چھوٹا سا ہے مگر اس میں انسانی جذبات و احساسات کی ایک بڑی جنت آباد ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس جنت سے ملی ہوئی دوزخ بھی موجود ہے۔

●●

دل کی دنیا
عصمت چغتائی
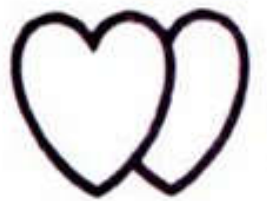
کیسا عجیب اور پر اسرار وقت ہوتا ہے، جب ایک دم آنکھ کھلے اور یہ پتہ نہ چلے کہ جھٹ پٹا ہو رہا ہے یا پوَ پھٹ رہی ہے! اپنا سر کدھر ہے اور پیر کدھر! کہاں سوئے تھے کہاں جاگے! اُس وقت سر پیر کی سمت معلوم کرنا کتنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر فوراً نہ معلوم ہوا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو جائیں گے۔

بچپن میں تو رونا آنے لگتا تھا۔ پھر کسی نا معلوم سمت سے ایک وزنی دھموکہ پڑتا اور ہمیں فوراً اپنے وجود کا اَتہ پتہ مل جاتا۔ یکلخت ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگتے اور ہم اپنے وجود کا مزید ثبوت دینے کے لئے فوراً مرغیوں کو کھدیڑنے لگتے یا آپس مین کتے کے پلوں کی طرح ایک دوسرے سے گتھ جاتے۔ تب اماں ہمیں دفعان ہونے کا حکم دیتیں۔ ہم ہنسی خوشی دفعان ہو جاتے اور باغ میں اَدھ کھِلی کلیاں چن کر جھولیاں بھرنے لگتے۔

یہاں تک کہ اندھیرا ہو جاتا۔ علی بخش لال ٹینوں کا گچھا صدر دروازے کے ٹاٹ کے پیچھے سے اندر بڑھا دیتے، بتیاں اکسا کر لالٹینیں گھر کے کونے کونے میں پہنچا دی جاتیں اور اندھیروں میں کھوئے ہوئے درو

دیوار پھر لوٹ آتے۔

پھر چوکیدار سیڑھی پر چڑھ کر صدر دروازے کی چوگر کو ربتی جلا دیتا۔ پودے ایک دم جھجک کر تاریکی میں کھسک جاتے اور ہمارے کرُتوں کی جھولیوں میں پھول کھلنے شروع ہو جاتے۔ تب بیکار ہی ڈر لگنے لگتا۔ ایک زرد رُو گرگٹ گال پھلائے کچ کچ منہ میں زہر گھولتا، پھر سرخ انگارا ہو کر چھلانگیں بھرتا املی کے درخت پر دوڑ جاتا۔ اور ہمارے پیر موم بتیوں کی طرح پگھلنے لگتے۔

اسی سمے دُور ترائی میں وہ پراسرار آواز لہراتی سنسناتی پھیل جاتی!

"کانہیا توری مُرلی بیرن بھئی۔"

ہم بگ ٹٹ بھاگ کھڑے ہوتے اور صدر دروازے کا پردہ اُلیچتے گھر میں غوطہ مار جاتے۔ پھولوں سے بھری جھولیاں بڑی بوڑھیوں کی جائے نمازوں پر الٹ کر ہم ان کے آنچلوں میں پناہ گزین ہو جاتے۔

"دادی اماں جلدی سے آیتہ الکرسی پھو کرو۔"

جب دادی اماں کی احمد حسین دلدار حسین کے قوام میں بسی ہوئی پُھو ہمارے چہروں پر پڑتی تب کہیں جا کے جان میں جان آتی۔

"کنہیا توری ی ی...... مُرلی...... بیرن بھئی۔" آواز دور اور دور ہو جاتی پھر گم ہو جاتی! صرف ہوا کی سائیں سائیں رہ جاتی۔

ہمارے ابا نئے نئے بدلی ہو کر بہرائچ آئے تھے۔ ہماری دو منزلہ وسیع کوٹھی کے سامنے ہی سید سالار مسعود غازی کی درگاہ تھی۔ پہلو میں

پائیں باغ تھا، جہاں ہماری جاگتی ہوئی زندگی کا بیشتر حصہ گذرتا تھا۔ کوٹھریوں کی قطار کے بعد ایک بہت بڑی سی باؤلی تھی۔ جس پر پُر چلا کرتا تھا۔ پچھواڑے بھٹوں کے کھیت تھے۔ دوسری طرف ایک سفید مسجد تھی اور دور تک ہار سنگھار، بیلا، چمیلی اور موگرے کے پیڑ چلے گئے تھے۔ مسجد سے ذراہٹ کے قبرستان تھا۔ اور نہر کے کنارے خربوزوں کے کھیتوں کے بعد مرگھٹ تھا۔ ہمیں اِن دونوں مقامات سے بے حد ڈر لگتا تھا۔ یہ پُر اسرار آواز اسی طرف سے آتی تھی، اور اس طرف سے آنے والی ہر شے خطرناک لگتی تھی۔

جب شرارت کرتے، اودھم مچاتے تو اسی آواز سے ڈرایا جاتا۔ "ڈائن ہے، کچا چبا جائے گی۔ بدروح ہے اکیلے دکیلے پکڑ لیا تو ٹونا کر دے گی۔ سنا ہے گھاگرا ندی میں کوئی بارات ڈوب گئی تھی۔ دلہن بھوتنی بن کر ترائی میں بھٹک رہی ہے۔"

اس آواز میں ایک اور خاصیت تھی کہ جب بھی یہ آواز سنائی دیتی تو قدسیہ خالہ پر دل کا دورہ پڑ جاتا۔ دانتی بھینچ کر منہ سے پھین نکلنے لگتا اور گھر ماتم کدہ بن جاتا۔

"یا قوی قادر...... قدسیہ کے دولہا کو کرو حاضر۔" نانی بیوی جھوم جھوم کر گڑگڑاتیں۔ مگر قوی قادر تو ایسے کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے تھے کہ کسی کی سنتے ہی نہ تھے، قدسیہ خالہ کے دولہا کو حاضر کرنے کے بارے میں کچھ غور فرما رہے تھے...... ان کی شادی کو دس برس ہونے کو آئے تھے۔

شادی کے بعد دولہا کو فوراً ہی نانا جان نے ولایت بھیج دیا تھا کہ یہی شرطِ شادی تھی۔

وہاں سے وہ اس زمانے کے دستور کے مطابق ایک عدد میم لٹکا لائے اور مین پوری میں پریکٹس کرتے تھے۔ اسی لئے قدسیہ خالہ وظیفے پڑھتیں، چلّے کھینچتیں اور جب وہ ناکام ثابت ہوتے تو دانتی بھینچ کے دورے ڈال لیتیں۔ اور غریب کیا کر سکتی تھیں۔ انہوں نے "سرتاجِ من سلامت" کے نام درجنوں خط بھیجے۔

"مجھے میم صاحب کی آیا سمجھ کر ہی ایک کونے میں ڈال لیجئے۔ آپ دونوں کی خدمت کروں گی۔ جھوٹن کھاؤں گی۔ اترن پہنوں گی اور منہ سے اُف کر جاؤں تو جو چور کی سزا سو میری۔ آپ مالک ہیں میں آپ کی لونڈی۔ میرے لئے اس سے بڑھ کے کیا خوش نصیبی ہو گی کہ آپ کے قدموں میں دم نکلے۔" وغیرہ وغیرہ، مگر سرتاج نے جواب دینا بھی حماقت سمجھا۔

عام طور پر قدسیہ خالہ کا لوگوں سے یہی کہہ کر تعارف کرایا جاتا تھا کہ "بھئی یہ ہیں قدسیہ، جن کے میاں نے میم ڈال لی ہے۔" لوگ خاصے مرعوب ہو جاتے تھے۔ اس وقت قدسیہ خالہ بھی اپنی نامرادی بھول کر فخر کرنے لگتی تھیں۔ ان کی سوت حاکموں کی بیٹی تھی۔ کیا عجب بادشاہ سلامت سے دور دراز کا ناطہ بھی ہو۔ ہر کوئی میم تھوڑی ڈال سکتا ہے۔ ایک طرح سے میاں نے میم سوتن لا کر ان کی عزت افزائی کی تھی۔ کوئی

دھوبن، چمارن بھی ڈال سکتے تھے۔

قدسیہ خالہ کی پندرہ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ چھٹے مہینے میاں ولایت کو سدھار گئے۔ دو سال تک تو دیوانگی سے عشق چلتا رہا۔ ہر وقت سر اوندھائے یا میاں کو خط لکھا کرتیں یا آیا ہوا خط پڑھا کرتیں۔ پھر خط پھیکے پڑنے شروع ہوئے، پھر ٹھنڈے پڑ گئے۔ یہ خط لکھ لکھ کے دیوانی ہو گئیں، وہاں سے جواب ندارد! پھر بُری بُری سناونیاں آنے لگیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد میموں کا بھاؤ گر گیا تھا اس لئے جو ولایت جاتا بہتی گنگا سے مچھلی مار لاتا۔ مگر قدسیہ خالہ کے میاں نرالے تھے۔ اور بھی لوگ میمیں لا رہے تھے۔ چھٹے چھ ماہے ہندوستانی بیوی کو صورت تو دکھا جاتے تھے۔ انہوں نے تو ایسی چپ سادھی کہ اُلٹ کے خبر ہی نہ لی۔

جب ہی تو عُرس پر قوالی ہوتی تو قدسیہ خالہ کو دورہ پڑ جاتا۔ آس پاس کہیں شادی ہوتی ان کی دانتی بھنچ جاتی، کوئی دور کہیں رات کے سناٹے میں برباگاتا، ان کے منہ میں پھین آجاتے۔ خاص طور پر یہ پر اسرار آواز جب بھی انہیں سنائی دیتی بے کل ہو کر ٹہلنے لگتیں۔ انگلیاں چٹخاتیں، آنچل مروڑتیں اور دورہ ڈال لیتیں۔

ہم کلیاں چن رہے تھے، جھولیاں چھلک رہی تھیں، مگر ہمیں صدر دروازے کے چوکور قندیل کے روشن ہونے کا انتظار تھا کہ یکایک وہ آواز بالکل ہماری پشت پر لہرائی۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہم نے چونک کر دیکھا۔ وہ مسجد کے پچھواڑے پرانے قبرستان میں ٹوٹی پھوٹی قبروں کے

درمیان آندھی میں گرے ہوئے ایک برگد کے درخت کے تنے پر کچھ روٹھی سی بیٹھی تھی۔ وہ گاتے گاتے رک گئی۔ ہمارے پیر بھوسا بھری بوریوں کی طرح دھنسنے لگے۔

"چھوڑو ہمرا آنچل!" وہ اپنی پشت کی طرف مڑ کر کسی کو ڈانٹ رہی تھی۔

ہم گرتے پڑتے بسورتے بھاگے۔

اس کا آنچل کوئی نہیں پکڑے تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہ ایک دم تنک کر کھڑی ہوگئی اور آنچل جھٹک کر ہنستی ہوئی تیز تیز بھاگی، جیسے کوئی شریر اسے پکڑنے دوڑ رہا ہو۔ تیز تیز چلتی وہ پیڑوں میں گم ہوگئی۔

تب ہماری گھگی بندھی اور پیروں کا بھوسہ بکھرنے لگا۔

"میرٹھ میں ملیں گے دونوں جنے۔" دور اس کی آواز نے لہرا لیا۔ اور ہم غڑاپ سے پردہ پار۔

"تم سیاں کالے، ہم گورے۔
آئینہ میں دِکھیں گے دونوں جنے۔"

اس کی آواز پھر کی کی طرح تھرکنے لگی اور ہماری پیٹھ پر موتی پرونے کی سوئیاں سی چلنے لگیں۔

"تم سیاں موٹے ہم دُبلے۔
کانٹے میں تلیں گے، دونوں جنے۔"

کیسے اتفاق کی بات تھی۔ قدسیہ خالہ کے دولہا کالے بھی تھے، اور موٹے بھی، مگر میر ٹھ میں ملنے کے کوئی آثار نہ تھے! پھر وہ دورہ نہ ڈالتیں تو کیا کرتیں۔

نانی بیوی کو تو فرصت نہ تھی۔ دادی اماں ابھی تسبیح پر بُدبُدا رہی تھیں۔ ان کی بہن دادی بی نے "چُھو" کی تب بھی خوف دور نہ ہوا۔ اُف! کتنی دادیاں، نانیاں، خالائیں، پھوپیاں، بھری پڑی تھیں مگر کوڑی کام کی نہیں۔ "چُھو" تک میں دم نہیں۔

"اُو کے منہ نہ لگا کرو بٹیا۔" مجاور نے جب ہم جمعرات کو درگاہ پر پھول چڑھانے جاتے تھے تو کہا تھا۔

"بڑی کھترناک عورت ہے۔"

"کیوں؟"

"بڑی منحوس ہے۔ مائی باپ کھسم سب کا کھائے گئی۔"

"کھا گئی۔" ہم سمجھے سچ مچ نمک مرچ چھڑک کر کھا گئی۔

"اکیلے ماں پائے گئی، تو تمہرا جیو نکال کے کھائے جئیے!" کمبخت نے اور ڈرایا۔

"کیا ڈائن ہے۔"

"اور کا؟"

"لاحول ولا قوۃ...... کیا بکواس ہے۔ نہیں بچو بے چاری پاگل ہے۔" شاہ صاحب نے مجاور کو ڈانٹا۔

"پاگل؟" شاہ صاحب کی بات ہمیں پسند نہیں آئی۔ سارا رومان ختم ہو گیا۔ صرف پاگل ہے اور وہ بھی مزے دار پاگل نہیں۔ نہ اس میں سے بدبو آتی ہے، نہ کپڑے پھاڑتی ہے، نہ اینٹے مارتی ہے۔ بس جب دیکھو گا رہی ہے۔

"سیاں توری گودی پھول گیندا بن جاؤں گی۔
بلما توری گودی۔"

آواز بڑی میٹھی تھی جبھی تو قدسیہ خالہ تڑپا کرتی تھیں۔

"اچھی بی اماں نگوڑی کو بلوائیے نا، ذری گانا سنیں گے۔"

"نا بٹی موئی پاگل کو کیا بلاؤ گی۔ اچھے بھلے گھر کی لڑکی، پردہ وردہ کو آگ لگا ہنڈو ہنڈو پھرے ہے۔ سنا ہے اس پر سایہ ہے۔ ساری بارات گھاگرا ندی میں ڈوب گئی۔ یہ تیرتی رہی تین دن تک۔ جانو کسی نے تلے ہتھیلی لگا دی ہو۔"

"پر دُکھیا گاتی اچھا ہے۔" قدسیہ خالہ کو گانا سننے کا جنون تھا۔ جب شبیر ماموں نعتیں پڑھتے تو ان کی آنکھوں سے ندی نالے بہہ نکلتے۔

"تم پہ قربان، میری جان، رسولِ عربی۔" وہ گاتے، اور قدسیہ خالہ آنچل میں ناک دبائے سسکیاں بھر بھر کے جھومتیں۔ سب تنے بیٹھے رہتے اور اس دورے کے پڑنے کا انتظار کرتے جو شبیر ماموں کے آنے اور نعتیں پڑھنے پر ضرور پڑ جاتا۔ خالہ کے ہاتھ ٹیڑھے ہو جاتے، آنکھیں نٹھور لیتیں، اور منھ سے جھاگ ابلنے لگتے۔ نانی دادی دوڑ کر ان پر آیتیں پڑھ کر

رم کرتیں۔

شبیر ماموں دور چوکی پر بیٹھے اپنے ہاتھوں کی لرزش چھپایا کرتے اور جب تک انہیں چین نہ آجاتا بے قرار صدر دروازہ کے پاس ٹہلے جاتے۔

شبیر ماموں قدسیہ خالہ کے رشتے میں دیور ہوتے تھے۔ غریب والدین کے نہایت مسکین، پھس پھسے اور مر گھلے سے اکلوتے بیٹے تھے۔ اور بہن بھائی پیدا نہ ہو کر زیادہ مزے میں رہے، ورنہ ہمارے ان ہی جیسے پھس پھسے اور مر گھلے بہت سے ماموں ہوتے۔ بڑے ہی دبلے پتلے اور قدسیہ خالہ سے کوئی گز بھر اونچے تھے۔ بالکل اونٹ کی طرح کُبھ نکال کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلتے تھے۔

''شبیر بھائی کچھ سنایئے۔'' قدسیہ خالہ ان کے آنے پر غمناک آواز میں فرمائش کرتیں۔ ''سنایئے نا، ذری جی ٹھہرے گا۔''

''کیا سناؤں، آج گلا خراب ہے۔'' وہ ہمیشہ ایک ہی عذر پیش کرتے۔ پھر ذرا گلا صاف کرتے، آنکھیں مچکاتے، نتھنے پھلاتے، دونوں ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے درمیان لٹکا لیتے اور......

''سن اے با--دِ صبا تو جا--نبِ طیبہ اگر گزرے
تو جاکر تھامنا -- باب حریم پاک کے پردے''

بڑی صاف نتھری ہوئی نرم آواز میں وہ گاتے۔ اس وقت ان پر بہت ترس آتا۔ بادِ صبا کمبخت بھی کانوں میں تیل ڈالے بیٹھی تھی۔ نہ ان

کی سنتی تھی نہ جانبِ طیبہ جاتی تھی۔

سب کو معلوم تھا کہ شبیر ماموں کو قدسیہ خالہ سے انس تھا۔ مگر کیا مرگھلا اونگھتا ہوا عشق تھا۔ گھر کی اور سیانی لڑکیوں لڑکوں کا بھی عشق تھا۔ کیا دندناتا، زقندیں مارتا! جب دیکھو دھینگا مُشتی ہو رہی ہے، کونوں کھتروں میں دبوچا جا رہا ہے۔ اکیلا پایا اور بھنبھوڑ ڈالا۔ تاش کے بہانے چھین جھپٹ، پچیسی کی کوڑیاں چھینی جا رہی ہیں۔ گھر کے بڑے بوڑھے ڈانٹ رہے ہیں۔ جنم میں تھوک رہے ہیں۔ مگر چکنے گھڑے کھی کھی ہنسے جا رہے ہیں۔

مگر شبیر ماموں تو پاس لگ کے بھی نہ بیٹھے، کبھی چھوٹی انگلی بھی نہ چھوائی۔ وہ شجر ممنوعہ جو تھیں۔ کسی اور کی امانت! جو انہیں رکھ کے بھول چکا تھا۔ پچیسواں ختم ہو کر چھبیسواں سال لگا تھا کہ مانگ میں پکے بال چمکنے لگے۔ سب ہی چاہتے تھے جلدی سے بوڑھی ہو جائیں کہ قصہ ختم ہو۔

"نا بھائی ہم اُو پگلیا کا ناہیں بلائے جاویں گے۔" دانہ دلنے والی سڑاندی پٹھانی بُوا سے قدسیہ خالہ نے خوشامد کی تو ٹکا سا جواب دیا۔ "کھسم کھانی ڈھیلا مارت ہے۔"

"بھئی کمال ہے اسے مردوئے چھیڑتے نہیں۔ کوئی اور سری کی ہوتی تو تِکا بوٹی ہو جاتی۔ نامراد بنی ٹھنی سولہ سنگار کئے رات برات جنگلوں میں گھومتی ہے، ڈر نہیں لگتا؟" چچی بی نے پوچھا۔

"ارے اُو کا کاہے کا ڈر؟ ہے مجال کوؤ کی، اُو کی طرپھ ٹیڑھی آنکھ

سے دیکھے۔" پھانی بولیں۔

"کیوں، کیا شیرنی ہے۔ پھاڑ کھائے گی؟ اکیلی دُکیلی گھومتی ہے۔"

"اکیلی ناہیں گھومت ہے۔ اُو کے میاں جو سنگ ہوت ہیں۔"

"میاں کون؟"

"بالے میاں......!"

"لو اور سنو! اے چل ہٹ دیوانی۔"

"چل ہٹ کا؟ کسم سے میاں کی پیاری ہے۔ اپنے گا.جی میاں کی بندنی ہے۔"

پھانی بوا نے تفصیل سے بتایا کہ وہ غازی میاں کی محبوبہ ہے۔ حالانکہ غازی میاں کو جامِ شہادت پیے چار سو سال سے اوپر ہو چکے ہیں۔ عشق صدیوں کے ہیر پھیر کا قائل نہیں۔

غازی میاں کے مزار پر ہر سال عرس ہوتا۔ دور دور سے قوال اور گویئے آتے۔ ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگ، بوڑھے، جوان، بچے، عورت، مرد زیارت کے لئے حاضر ہوتے، منتیں مانی جاتیں، مرادیں پوری ہوتیں۔ ہر جمعرات کو شہر کی، اور آس پاس کے قصبوں کی طوائفیں نذرانہ لے کر آتیں۔ میاں کی شان میں غزلیں، ٹھمریاں، دادرے گاتیں۔ جب کسی نوچی کی نتھنی اتاری جاتی تو پہلے وہ میاں کے مزار پر حاضر ہو کر مجرا گزارتی۔ مئی جون کی شعلہ بار گرمیوں میں میلہ لگتا۔ عقیدت مند مہینوں

پہلے سے آکر پڑاؤ ڈال دیتے۔ عین میلہ کے دنوں میں اتنی خلقت جمع ہوتی کہ آس پاس کئی میل تک تِل دھرنے کی جگہ نہ رہتی۔ درگاہ کے بلند دروازہ کے آگے دل بادل تانا جاتا۔ زائرین آتے۔ پھولوں کا دونا، مٹھائی اور پیسے شامیانے پر اچھال دیتے۔ مختلف گاؤں اور قصبوں سے جھنڈے آتے۔ ساٹھ ساٹھ فٹ کے بانسوں کے سرے پر سیاہ یا سفید بالوں کا گچھا آویزاں ہوتا، اس کے نیچے پچاس کا پھریرا لہراتا ہوتا۔ جس کی منّت پوری ہوتی، وہ مزار پر جھنڈا چڑھاتا۔ ڈھول تاشے بجاتے، کودتے، اچھلتے درگاہ کے سامنے پہنچ کر ایک حلقہ بنالیتے، بیچ میں ایک مضبوط سا آدمی جھنڈا لئے ہوتا۔ سہارے کے لئے اس کے سرے پر رسیاں باندھ کر چار آدمی تانے رہتے کہ جھنڈا سر نگوں نہ ہو جائے۔ پھر وہ پہلوان اس جھنڈے کو اونچا اٹھا کر رقص کرتا۔ عجیب عجیب کرتب دکھاتا۔ کبھی جھنڈا ماتھے پر سادھ کر تھرکتا، کبھی دانتوں پر رکھ کے جھومتا۔ جب سب پسینہ پسینہ ہو جاتے یا شاید وقت ختم ہو جاتا، کیونکہ دوسرے جھنڈوں کے جلوس منتظر کھڑے ہوتے کہ ایک جھنڈے کا ناچ ختم ہو تو دوسرے کو موقع ملے۔ پھر تھکے ہارے جھنڈے کو جہاز کے مستول کی طرح پھریرے میں لپیٹ کر کندھوں پر رکھ کے بلند دروازہ سے اندر لے جایا جاتا۔ اور دوسرے جھنڈے کا ناچ شروع ہو جاتا۔ میلے کے خاتمہ پر جھنڈے نیلام کر دیئے جاتے تھے۔ ہماری اماں ہر سال یہ جھنڈے خرید کر انہیں چوکیوں پر جازموں کی طرح استعمال کرتی تھیں۔ یہ جازمیں سوزن کاری کا لاجواب نمونہ ہوا کرتی تھیں۔ کھدر پر

مختلف رنگوں کے کپڑوں کی کترنوں سے ہاتھی گھوڑے بنے ہوتے تھے۔ کہیں فوجیں نیزے اٹھائے جارہی ہیں، کہیں اونٹ سواروں کی قطاریں، کہیں بھیڑ بکریوں اور گایوں کے ریوڑ، کہیں راز و نیاز میں مصروف عورت مرد، ہم گھنٹوں چوکیوں پر لوٹ لوٹ کر نظارے کرتے مگر جی نہ بھرتا۔

جھنڈوں کے علاوہ جس کی بھی منّت پوری ہو جاتی وہ خوش نصیب سونے چاندی کے پُتلے، میز کرسی، مسہریاں اور برتن حسب وعدہ چڑھاتا۔

پھر غازی میاں کی شادی کی رسمیں شروع ہو جاتیں۔ بلند دروازہ پر نوبت رکھی جاتی۔ بڑی ہی اکتا دینے والی تال میں صبح تڑکے سے بجنا شروع ہو جاتی اور رات گئے تک بجا کرتی۔ گروہ کے گروہ آکر نوبت بجانے والوں کو گھیر لیتے۔ پھر دو چار منچلے کانوں پر ہاتھ رکھ کے برہا گانے لگتے۔ ایک گروہ شل ہوتا تو دوسرا اس کی جگہ آجاتا۔ آسیب زدہ عورتیں میاں کی چوکھٹ پر بھوت اتروانے آتیں۔ بال کھول کر سر دھنتیں۔ جب منتر پڑھنے والے دھونی دیتے تو چیخیں مار کر بیہوش ہو جاتیں۔ پھر ہوش میں آکر جھومنے لگتیں۔ زبردست قسم کا بھوت ہوتا تو کئی کئی دن ہو جاتے، ڈٹا رہتا۔ لال ہرے ڈنڈوں سے بھوت کی خبر لی جاتی، تب بڑی مشکل سے جان چھوڑتا۔ پھر صحت پانے والی درگاہ پر چڑھاوا چڑھاتی۔ اور خوشی خوشی رخصت ہو جاتی۔

پانچ تاریخ کو پنکھا اٹھتا۔ پھر سات کو صندل اور نو کو مہندی۔ اسی

شب کو غازی میاں کا کرتا جس پر مکمل کلام مجید لکھا ہوا تھا زیارت کے لئے کھولا جاتا۔ خلقت ٹوٹ پڑتی۔

گیارہ تاریخ کو بارات چڑھتی۔

رادھا بائی عرف زہرہ بی ردولی کی بال ودھوا میاں کو دل دے بیٹھی۔ غازی میاں نے اسے خواب میں بشارت دی اور اُسے سوئیکار کر لیا۔ وہ مزار پر دھونی رما کر بیٹھ گئی۔ روز اپنے آنسوؤں سے مزار کو اشنان کراتی اور بالوں سے فرش جھاڑتی۔ اس کا باپ تیلی تھا۔ وہ اسے زبردستی گھسیٹ لایا، مگر رادھا اپنی ضد پر اڑ گئی۔

ادھا نام کی سب ہی لڑکیاں بڑی ضدی ہوتی ہیں۔ ببانگِ دہل وہ اپنے عشق کا اعلان کرتی ہیں۔ ساری ذلتیں اور بدنامیاں ہنس کے جھیلتی ہیں، تن من دھن کی بازی لگا دیتی ہیں اور پانسہ ان کے ہی حق میں پڑتا ہے۔ مخالف ہوائیں ان کے جذبۂ عشق کے آگے سر جھکا دیتی ہیں۔ پھر لوگ ان کے اس جذبہ کی پوجا کرتے ہیں۔ ان کی شان میں گیت گاتے ہیں اور انہیں دیوی کا استھان بخشتے ہیں۔

غازی میاں کی رادھا کو انگاروں پر چلنا پڑا اور کانٹوں میں گھسٹنا پڑا۔ اس کی ماں نے اسے چار چوٹ کی مار دی۔ باپ نے بھیگی رسّی سے اس کی کھال ادھیڑ دی اور بھینس کے کھونٹے سے باندھ دیا۔ اور سارے گاؤں نے اس کے منھ پر تھوکا۔

آدھی رات کو جب بھوکی پیاسی رادھا زخموں سے چور گوبر میں

لت پت پڑی دم توڑ رہی تھی تو غازی میاں نے اپنے آنسوؤں سے اس کے زخم دھوئے، اسے اپنی مقدس چھاتی سے لگایا اور اپنے خونِ جگر میں شہادت کی انگلی ڈبو کر اس کی مانگ بھر دی۔

جب متوالی میرا نے اپنے گردھر گوپال سے پیار کیا تو دنیا نے اس کی زندگی میں ناگ چھوڑ دیئے۔

اور زہر کا پیالہ دیا۔

پھر کرشن مُراری کی مُرلی جاگ اٹھی۔

اور ناگ پھولوں کی مالا بن گیا۔

زہر کا پیالہ امرت سے چھلک پڑا۔

صبح سویرے ردولی والوں کی آنکھ کھلی تو مندروں میں گھنٹے بج رہے تھے اور مسجد کے برج سے اذان گونج رہی تھی۔ رادھا چندن میں بسی شاہانہ جوڑا پہنے پھولوں کی سیج پر ابدی نیند سو رہی تھی۔ جسم پر ایک خراش کا نشان بھی نہ تھا۔ کندن کی طرح شریر جگمگا رہا تھا۔ مانگ میں سیندور مسکرا رہا تھا۔

ردولی والوں کی جان نکل گئی۔ پنچایت بیٹھی اور فیصلہ ہوا کہ بیٹی پرائے گھر کی ہو چکی۔ اب میکہ میں اس کا کیا کام۔ لہٰذا دلہن کو سسرال پہنچا دیا گیا۔

ہندو اُسے رادھا کہتے ہیں اور مسلمان زہرہ بی بی۔ مزار کے قدموں میں اس کی سادہ سی قبر تھی، پائنتی املی کا ایک جغادری پیڑ ہوا کرتا تھا

جس کی چھال جلانے سے صندل کی خوشبو آتی تھی۔

ہر سال ردولی والے غازی میاں کی بارات لے کر آتے ہیں۔ سر شام ہی سے بچوں کو سلا دیا جاتا تھا کہ رات کو تین بجے بارات پہنچے تو جگا دیا جائے۔ جونہی جانی پہچانی شہنائیوں کی آواز سنائی دیتی سب کو جگا دیا جاتا۔ منہ پر جلدی جلدی پانی کے چھپکے مار کے سوئی سوئی آنکھوں سے بارات دیکھنے کوٹھے پر چڑھ جاتے۔

کتنے سال ہو گئے مگر آنکھوں میں اب تک وہ بارات بجی ہوئی ہے۔ آگے آگے سفید گھوڑا۔ سونے چاندی کے زیورات میں غرق پھولوں سے ڈھکا ہوا۔ سہرے کی لڑیاں گھوڑے کے سموں کو چومتیں۔

"وہ دیکھو، وہ بالے میاں۔" ہمیں واقعی وہ گھوڑے پر بیٹھے نظر آنے لگتے۔

اس کے پیچھے سرخ شبنم کے پردے پڑی پالکی، جس کے وسط میں کلام مجید رکھا ہوتا اور ایک شمع روشن ہوتی۔

"دلہن دلہن۔" ہم مسحور ہو جاتے۔ شمع کی تھرتھراتی ہوئی لو سرخ شبنمی پردوں کے پیچھے سے بالکل شرمائی لجائی دلہن کی طرح لگتی تھی۔ دلہن کے بعد براتی ہاتھوں میں روپہلی سنہری موتیوں کی جھالریں لگی، چھوٹی چھوٹی چھتریاں جن پر سلمہ ستارے کا کام کیا ہوتا تھا۔ پھر کیوں کی طرح گھماتے جھومتے ناچتے جوق در جوق اُمڈتے چلے آتے۔ آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ کئی کئی دن تک پتلیوں میں چھتریاں ناچتی رہتیں۔

کبھی کوئی بہت ہی خوبصورت چیز دیکھو تو جی بھر آتا ہے۔ قدسیہ خالہ کا جی تو ہر دم بھرا ہی رہتا تھا، بس چھلکنے کے لئے بہانہ کی ضرورت ہوتی۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر سر رکھے وہ لمبے لمبے آنسو بہائے جاتیں۔

بارات دیکھ کر ان کا کلیجہ کٹنے لگتا تھا۔ سب ہی اُداس ہو جاتے تھے۔ یہ بارات تھی یا جنازہ!...... ایک ننھی سی کمزور لڑکی پر زندگی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے خوابوں کی دنیا بنا کر ایک چھوٹی سی جھری کھولنا چاہتی۔ مگر ناسمجھ انسان اجازت نہیں دیتے کیونکہ وہ ان کے یقین میں رخنہ ڈالنا چاہتی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے کہ ان کا سارا یقین چکنا چور کر کے منہ موڑ لیتی۔

مگر شبیر ماموں نہ تو کنہیاجی تھے، نہ غازی۔ وہ تو نہایت ادھورے اور کھوکھلے انسان تھے۔ وہ قدسیہ خالہ کی زندگی میں پھنکارتے ناگوں کو اپنی بانسری سے پھولوں کی مالا نہیں بنا سکتے، نہ ان کی روح پر لتھڑے ہوئے گوبر کو اپنے یقین کے بل بوتے پر چندن بنا سکتے تھے۔ ان کی دولت تو دو لرزتے ہوئے ہاتھ تھے جن سے وہ مچلتی ہوئی آرزوؤں کا گلا گھونٹنا خوب جانتے تھے! اور قدسیہ خالہ چھبیس برس کی عمر میں بھولی ہوئی بات بنی سسک

رہی تھیں۔ ان میں اتنی ہمت بھی تو نہ تھی کہ بُوا کی طرح پاگل ہی ہو جاتیں۔ ان سے بھی لوگ ڈرنے لگتے۔ ان کے "غازی میاں" پر تو سب ترس کھاتے تھے اور مذاق اڑاتے تھے۔ بہت سے مُردے زندہ لوگوں سے زیادہ جی دار ہوتے ہیں۔

بُوا قدسیہ خالہ سے کچھ ہی بڑی ہوں گی۔ عورت کے دل میں کمسنی ہی سے ہزاروں خوف بھر دیئے جاتے ہیں۔ جوانی کو وہ ایک کچی ٹھلیا سمجھنے لگتی ہے جسے قدم قدم پر کنکریوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ بُوا کی دیوانگی نے دل سے اور بہت سے خدشوں کے ساتھ عزت آبرو لٹنے کا خوف بھی خرُد برُد کر دیا تھا۔ کچی ٹھلیا کے بجائے وہ ٹھوس گولا لڑھکاتی تھیں۔ مردانہ وار اندھیرے اجالے جہاں جی چاہتا چلی جاتیں۔ کچھ ایسی دہشت بٹھادی کہ لوگ مان گئے۔ نہ جانے کس طرح دو چار معجزے ہوگئے جو یقین بن گئے۔ ایک دفعہ کسی بدمعاش نے انہیں اکیلا پاکر دبوچنا چاہا، غازی میاں نے اس زور کا لپّڑ رسید کیا کہ اس کا تھوبڑا وہیں کا وہیں ٹیڑھا ہو گیا۔ ایک اور کم نصیب الجھا تھا۔ سنتے ہیں جس ہاتھ سے اس نے ان کی کلائی پکڑی تھی وہ سڑ گل کر گر گیا۔

چچا میاں تو مُرتِد تھے ہی، کہا کرتے تھے۔ "درگاہ میں ہر سال ہزاروں کوڑھی شفا کی آس لگا کر آتے ہیں، ہاتھ پیر سڑ گل کر گر جانا معجزہ نہیں بیماری ہے۔ اور شرابی کو لقوہ مار جانا بھی کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں۔"

مگر ہمیں تو بُوا پر شک کرتے ڈر لگتا تھا کہ کہیں تھو بڑا وہیں کا وہیں ٹیڑھا ہو گیا تو کیا کریں گے۔ بڑی جناتی طبیعت پائی تھی۔ پر جب سے معلوم ہوا تھا ذرا سی پاگل ہیں بھتنی وتنی نہیں تو ہمیں ان سے ڈر بھی نہیں لگتا تھا۔ ایک دن برگد کے پیڑ کے نیچے کھڑی سلیپر اتار کر مٹی جھاڑ رہی تھیں، ہم نے قدسیہ خالہ کا پیغام انہیں پہنچا دیا۔

"نہ آئیں گے۔" بڑی رُکھائی سے بولیں۔ "جب ہمراجی کرہے آئے جاویں گے۔" اور پلیا سے گذر کر جو پگڈنڈی جاتی تھی اُدھر ہولیں۔

پھر خدا خدا کر کے ایک دن ان کا جی کرا اور وہ کھٹ سے آگئیں۔ نہایت بے تکلفی سے بغیر کسی سے بولے چالے، پانی پینے کے مٹکوں کے پاس گئیں۔ ایک کٹورا پانی پیا۔ تھوڑا سا آنچل میں بندھی بیلے کی کلیوں پر چھڑکا، پھر آنچل سر پر دھر لیا اور بالکل باہر والیوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کے مسکرانے لگیں۔ اماں ہمیشہ کہتی تھیں کہ شریف زادیاں کولھے پر ہاتھ رکھ کے نہیں کھڑی ہوتیں، ایسے باہر والیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ ایک ایسی بھی عمر ہوتی ہے جب ہاتھ وبالِ جان ہوتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا انہیں کہاں رکھا جائے۔ تو اس خوف سے کہ باہر والی کہیں نہ بن جائیں سر پر ہاتھوں کی پالتی مار کر رکھ لیتے۔

"اے ہے نگوڑی سر کیوں پیٹ رہی ہے؟" تب اماں برا مانتیں۔

"پھر کہاں رکھیں؟" ہم عاجز آجاتے۔

"چولہے میں۔" وہ اور جل جاتیں۔ "غارت ہو یہاں سے۔" اور

ہم وہاں سے غارت ہو جاتے۔

بُوا ایک دم آپ ہی آپ ہنسی پھر چوکی پر بیٹھ کر تنگ پاجامہ کی چوڑیاں سنوارنے لگیں۔ ان کے کپڑے بہت اُجلے لگ رہے تھے۔ گلابی دوپٹہ کلف دے کر مروڑا ہوا کندھوں پر پڑا تھا۔ بیلے کی کلیوں کا گچھا آنچل میں بندھا کنپٹی پر جھول رہا تھا۔

انہیں گھورتے دیکھ کر قدسیہ خالہ نے کھٹ سے آنکھیں جھکا لیں اور بے کار ہی تن ڈھکنے لگیں۔

"دھنا روئے روئے انکھیاں لال گال۔" وہ قدسیہ خالہ کو جیسے چڑا کر گا رہی تھیں۔

"پان پچاسی کے بیڑا لگائے
ہمرے نٹھور پیا ا جھو نہ آئے
دھنا روئے روئے...... انکھیاں"

قدسیہ خالہ تو چلّو میں آنسو لئے بیٹھی رہتی تھیں۔ بس چھڑ کنے لگیں۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ دورہ ڈال پاتیں بُوا تڑک کے باغ والے دروازے سے غائب۔

"چن چن کلیاں سیجیں بچھائیں۔" دور ان کی آواز لہرائی۔

"دھنا روئے روئے انکھیاں...... لال گال۔"

سب پر رعب طاری ہو گیا۔ بُوا غیب دان ہیں۔ قدسیہ خالہ کو چٹ سے پکڑ لیا۔

"کہیں سن چکی ہو گی۔" چچا بولے۔ دہریئے تھے نا۔ مگر ان کی بات کا کسی نے یقین نہ کیا۔ اس کے بعد وہ آنے جانے لگیں۔ آتیں، بیٹھتیں، جی گھبراتا، اٹھ کر چل دیتیں۔

"اے بیٹھو نہ بوا......" قدسیہ خالہ خوشامد کرتیں۔

"ناہیں بھائی ہمکا جائے کا پڑی۔ ہمری باٹ دیکھت ہوئے۔" اور ہم سمجھے واقعی غازی میاں کدم کی چھیّاں تلے کھڑے اُن کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔

"اچھی بھلی شریف گھرانے کی ہے۔ نگوڑی کی مت ماری گئی۔"

"نہیں بی مجھے پاگل تو نہیں لگے ہے۔"

"اوئی تو کیا ڈھیلے مارے جب ہی مانو گی کہ پاگل ہے۔ گھر میں چمریا کو گھسار کھا ہے، موئی کوڑی کی دیوال نہیں۔ جس کا جی چاہے ڈُکھیا کو لوٹ لے، خبر بھی نہ ہو گی۔"

"اے بی اس کا ذکر نہ کرو۔ میرے جی میں وہم آتا ہے۔" نانی اماں بولیں۔

"تو کیا میں اس کے برے کو کہتی ہوں؟"

"اس کے اچھے برے کا کیا ٹھیک۔ مولوی صاحب نے بھی اس کے بھلے ہی کو کہا تھا کہ شرع کرلو، یوں ماری ماری پھرتی ہو۔ یہ ان کی جان کو آ گئیں کہ "اپنی اماں کا نکاح پڑھادو کسی راہ چلتے سے۔"

"بغیر مرد کے عورت کی عزت محفوظ نہیں ہوتی۔" مولوی

صاحب نے سمجھایا۔

''ہمرا مرد موجود ہے۔ تمہرے باپ کا باپ۔ سن پئہے تو تمہری ڈاڑھی ماں آگی لگائی دیہے۔''

غازی میاں کی پیاری کو کوئی کچھ کہے اور وہ چپ چاپ سن لیں! مُلا جی کا جوان بیٹا باؤلی سے ڈول بھر کے مڑ رہا تھا کہ سانپ نے ڈس لیا۔ مُلانی نے بُوا کے تلوے چاٹے، جوتی پر ناک رگڑی تو لڑکے کی جان بچی۔

''پانی کا سانپ ہوگا۔ زہریلا نہیں ہوتا۔'' چچا میاں کا کہنا تھا۔

مگر کون سنتا ہے اپنے ایمان کے آگے؟ لوگ بُوا سے اور بھی ڈرنے لگے۔ ایسی ویسی نہ تھیں ''میاں'' کی چہیتی محبوبہ تھیں! غازی میاں جو بانجھ کی گود میں پھول کھلاتے، کوڑھی کا کوڑھ مٹاتے، ایک پل میں فقیروں کو شاہ اور شاہوں کو کنگال بنا دیتے۔ کیا اپنی لاڈلی کا اتنا مان نہ کرتے ہوں گے۔ قدسیہ خالہ کو اب بھی امید تھی کہ شاید میم بانجھ ہے چونکہ ابھی تک چوہے کا بچہ تک نہ جن پائی تھی۔ نانی بیوی کے چلّوں اور وظیفوں نے اس کی کوکھ پر تالا ڈال رکھا تھا۔ مولا کو دن پھیرتے دن نہیں لگتے۔ میاں کے مزار پر منّت بھی مان رکھی تھی کہ خیر سے قدسیہ کے دن پھر گئے اور گود بھری تو چاندی کا پتلا چڑھائیں گی۔ تین سال سے نانی بیوی چاندی کا پالنا میاں کے قدموں میں چڑھا رہی تھیں کہ یا غازی میاں یہ پالنا بھر دو۔ ادھر قوی قادر سے سفارشیں جاری تھیں کہ قدسیہ کے دولہا کو حاضر کریں۔ مگر چلّے وظیفے اور دعائیں کچھ خلط ملط ہو گئیں۔ پالنا بھرا مگر میم کے وسیلہ سے۔

جس دن سوتن کے ہاں بچی پیدا ہونے کی خبر ملی قدسیہ خالہ اور بھی زمین دوز ہو گئیں۔ جیسے ان کی بچی قبر پر سنگ مرمر کا مزار کھڑا کر دیا گیا۔ اب تو روزِ حشر منکر نکیر کو ان میں جان ڈالتے ہوئے آنکس آئے گی۔

بُوا کئی دن سے نہ جانے کہاں غائب تھیں۔ ایک دم سے آن دھمکیں۔ نانی بیوی اُس نائن کی خبر لے رہی تھیں جو لڈو دینے آئی تھی۔ نانی بیوی نے لڈو موری میں لڑھکا دیئے اور نائن کا چونڈا مونڈنے کی دھمکی دینے لگیں۔ وہ نگوڑی بھاگی اپنا لہنگا سنبھالتی۔ بُوا نے جو بچی کی پیدائش کی خبر سنی تو باؤلوں کی طرح چہکنے لگیں۔

"اے بڑی بٹیا، سوتیا کی گود ہری ہوئی گئی۔ سٹورا اچھوانی نہ بنٹیہیو؟" پھر کھونٹی سے ڈھولکی اتار کے اوندھی سیدھی زچہ گیریاں الاپنے لگیں۔

"پیر میں پینجنیاں لالہ چھم چھم کھیلے گا۔" لالہ تو پیدا ابھی نہیں ہوا تھا۔ چھم چھم خاک کھیلے گا۔ نانی بیوی کو یہ بے وقت کی راگنی کھل گئی۔ وہ ٹانگ لی کہ بُوا نے ڈھول ایک طرف لڑھکایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی مسجد کے پچھواڑے جا بیٹھیں۔ بُوا کئی دن کے لئے اُڑن چھو ہو گئیں۔ ان کی یہی عادت تھی، دن ہو کہ رات جب وحشت بڑھتی پیدل نکل کھڑی ہوتیں۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں نکل جاتیں۔ کوئیں کی منڈیر پر گھڑی بھر کو دم لیتیں۔ کوئی نیا گیت سنائی پڑ جاتا تو اسے سمیٹ کر اپنے گیتوں کے خزانے میں جمع کر لیتیں، پھر آگے بڑھ جاتیں۔ کئی کئی دن بنا کھائے چلتی چلی

جاتیں۔ پاگلوں میں بڑا دم ہوتا ہے۔ سوتے ہوئے ہم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ نہ انہیں سانپ بچھو چھیڑتے نہ جنگلی جانور۔ ترائی کے اُدھر گاؤں میں شیر لگتا تھا۔ مگر انہیں دیکھ کر راستہ چھوڑ دیتا۔ کچھ لوگ تو کہتے تھے وہ انہیں ماتھا ٹیک کے سلامی دیتا تھا۔

ایسے وثوق سے بُوا غازی میاں کی شرارتوں کے قصے سناتیں کہ شک کرنے کی گنجائش نہ رہ جاتی۔ درگاہ کے پاس رہ کر ہر بات یقین آنے لگتی ہے۔ میاں بڑے ضدی اور ہٹیلے تھے۔ ہر وقت چھیڑ خانیاں کیا کرتے۔ کبھی آنچل پکڑ کے کھینچ رہے ہیں، کبھی چوڑیاں مُرکائے دیتے ہیں۔

"اے بی، میاں تم پر عاشق کیسے ہو گئے؟" قدسیہ خالہ پوچھتیں۔

"دل آئے گوا!" بُوا نخرے سے مسکراتیں۔

"یہی تو پوچھتی ہوں دل کیسے آیا؟" قدسیہ خالہ کو دل لانے کے گر معلوم کرنے کی بڑی فکر رہا کرتی تھی۔ تن من دھن نچھاور کرنے کے بعد بھی انہیں تو کسی کا دل نہ ملا۔

"اب ای ہم کا بتاویں۔ ان ہی سے پوچھ لو۔ ای کا سامنے کھڑے مسکراوت ہیں۔" وہ سپاٹ دیوار کی طرف ٹھینگے سے اشارہ کرتیں اور سب ڈر کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے۔ ہماری مادی آنکھوں کو کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ ان کے لئے تو چودہ طبق روشن تھے۔

"ملاقات کیسے ہوئی؟"

"پنیا بھرن جات رہیں، باٹ روک کے کھڑے ہو گئے!"

''پھر؟'' ہم ان کے پاس کھسک کے پوچھتے۔

''ہم اُٹھ کے بھاگیں۔ بس ہمری کلائی پکڑ لیہن!''

''پھر؟'' ہم اور کھسکتے۔

''ہمرا باپو گُستائے گئے؟'' وہ کہیں دور خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتیں۔ ''کہن مانجھی کا پوُت ہے ہم اپنی دِھی نہ دیں گے۔''

''مانجھی کا پوُت؟''

پھر بُوا بتاتیں کہ ماڈی آنکھوں کے لئے میاں ایک مانجھی کے بیٹے کا روپ دھار کے ان کے باپو سے پیر پکڑ کے انہیں مانگنے آئے تھے۔ باپو گُستائے گئے اور انہیں دھتکار دیا۔ پھر ان کی شادی کسی دوسری جگہ کر دی۔ رات کو جب برات گھاگرا ندی پار کر رہی تھی زبردست طوفان آیا۔ میاں جو مانجھی بنے اُسی نوکا کی پتوار سنبھالے تھے، وہی طوفان لائے تھے۔ انہوں نے سب کو چھوڑ کر انہیں بچانے کی کوشش کی مگر براتیوں نے گڑبڑ شروع کر دی۔ گُستائے کے بالے میاں نے نوکا الٹ کر سب کو ڈبو دیا اور بُوا تین دن تک پانی پر دلہن بنی پھولوں کی سیج پر تیرتی رہیں۔

''پھر؟'' ہم کھسک کر بالکل ان کی گود میں گھس جاتے۔

''پھر تمہرا کھوپڑا۔'' وہ اکتا کر ہمیں دور دھکیل دیتیں اور کھوئی کھوئی آنکھیں لئے قبرستان میں برہے گاتی سرگرداں گھومتیں۔ بُوا کنواری تھیں۔ کسی مٹی کے پتلے نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ بارات کے ڈوبنے کے بعد وہ کسی طرح کنارے سے لگ گئیں۔ کئی دن جنگلوں میں سرگرداں

پھرتی رہتیں۔ جب ان کے والدین کو ان کا پتہ چلا تو دوڑے آئے۔ مگر جب تک بُوا اپنے خوابوں کی دنیا میں پہنچ چکی تھیں۔ انہوں نے سہاگ کی چوڑیاں ٹھنڈی کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ سہاگن تھیں اور بالے میاں ان کے دولہا تھے۔ بالے میاں سے الجھنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

"اُو ہمکا بلاوت ہیں؟" ان کا جب جی چاہتا نکل کھڑی ہوتیں اور جنگلوں میں عشقیہ لوک گیت گاتی پھرتیں۔ ان کی مرضی کو بالے میاں کی مرضی اور خدا کا حکم سمجھ کر کسی نے چوں نہ کی۔ پھر آہستہ آہستہ ان کے بارے میں معجزے مشہور ہونے لگے تو اور بھی لوگوں کی ان سے کتنی دبنے لگی۔ وہ پوجی جانے لگیں۔ لوگ میاں سے سفارش کرانے کے لئے ان کی سیوا کرتے۔ جدھر نکل جاتیں آنکھیں بچھاتے۔ ان کا کام کرنا خوش قسمتی سمجھتے۔ جس کی مراد پوری ہوتی وہ غازی میاں کے مزار پر چڑھاوا چڑھانے کے ساتھ ان کے لئے بھی گلابی دوپٹہ اور تیل، عطر، پھول اور چوڑیاں نذر کرتا۔ کھانا وہ کھاتی ہی کتنا تھیں۔ کئی کئی دن بھوکی رہ لیتی تھیں۔ لوگ تھال سجا کر ان کے گھر دے جاتے، وہ اٹھا کر فقیروں کو کھلا دیتیں۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد وہ اسی طرح اکیلی رہتی تھیں۔ ایک چمارن گھر کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ دنیا بھر کے کپڑے پھاڑنے اور کھونے والی دھوبن ان کے کپڑے سب سے اُجلے دھوتی تھی۔ تھوڑی بہت زمین بھی تھی مگر انہوں نے وصولی کبھی ضروری نہ سمجھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ لوگ انہیں غازی میاں کی پیاری ماننے لگے تھے۔ وہ انہیں بھی پیاری تھیں۔ انہیں کسی سے

ڈرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ان پر جان نچھاور کرنے والے بہت تھے۔ اس لئے وہ ایک کمزور عورت ہوتے ہوئے بھی اپاہج اور مجبور نہیں تھیں۔ مردوں کے تمام حقوق انہیں حاصل تھے۔ رات برات اکیلی جہاں چاہتیں اونچی آواز سے اعلانِ عشق کر دیتیں، اونچی آواز سے الاپتیں، آوازے کستیں، دھڑ سے گالی بک دیتیں۔ مردوں کے ساتھ بیٹھ کر قوالی سنتیں اور چھنا چھن روپئے پھینکتیں۔ غازی میاں کے سالانہ میلہ کے زمانہ میں لاکھوں زائرین کے ہمراہ ہزاروں لچے بدمعاش بھی آنکلتے، آئے دن اغوا اور آبروریختی کے واقعات سننے میں آتے۔ بیگمیں بند شکرم میں چپراسیوں کے پہرے میں نکلتے خطرہ محسوس کرتیں اور وہ مزے سے بھیڑ کو چیرتی، گلابی آنچل لہراتی پھرتیں۔

''اے ہے بُوا زمانہ بڑا خراب ہے۔ میلے میں نہ جاؤ۔'' اماں انہیں ٹوکتیں۔ ''اکیلی گھومتی ہو ڈر نہیں لگتا۔''

''کون ہم اکیلے گھومت ہیں؟ ارے ہم اکیلے ناہیں، ہمرا ساتھ اُو جو رہت ہیں۔'' یعنی ان کے ''وہ!''۔۔۔'' مجال ہے کوئی کی جو ہم سے بولے۔''

سب لاجواب ہو جاتے۔ کون الٹی سیدھی بات کہہ کے آفت سر مول لے، کون جانے معجزہ ہو جائے تو؟

''سالی لفنگی ہے؟'' شروع شروع چچا میاں اُن سے چڑتے تھے۔ بکواس کر دیا کرتے تھے۔ ''پاگل واگل کچھ نہیں سب کو الّو بناتی ہے۔''

اُسی رات چچا میاں کے ایسا گردے میں درد اٹھا کہ چیں بول گئے۔ لاکھ بے چارے نے بحث کی کہ دردِ گردہ کا انہیں پرانا مرض ہے مگر صاحب کون سنتا ہے۔ اماں نے بُوا کو خوب پرچایا، ان سے دبی زبان سے کہا کہ میاں سے سفارش کردیں۔ بے چارے جاہل ہیں۔

درد کم تو ہونا ہی تھا مگر اماں نے اسے بُوا کی سفارش کا اثر ہی سمجھا اور چچا میاں کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر اب انہوں نے ایسی ویسی بات کہی تو سر پیٹ لیں گی۔ ان کا کیا ہے بگوڑے ناتھے۔ جورو نا جاتا اللہ میاں سے ناطہ۔ وہ تو خیر سے بچوں والی ہیں۔ وہ کسی سے بیر نہیں پال سکتیں۔ ابا کو تو انہوں نے پہلے ہی قسم دلا دی تھی کہ اگر بُوا کی شان میں ایک لفظ بھی کہیں تو ان کا مرا منہ ہی دیکھیں۔ ابا کہتے تھے یہ پیری مریدی بدعت ہے۔ مگر اماں کو عاقبت سے اپنا سہاگ زیادہ پیارا تھا۔

جب بُوا اور گھل مل گئیں تو ایسا لگا جیسے اللہ میاں سے سمجھوتہ ہو گیا۔ بُوا کے ناطہ غازی میاں بھی اپنے کچھ لگتے تھے۔

موڈ میں ہوتیں بُوا تو کبھی رات کو بھی رہ جاتیں۔ ہم لوگ ان کے ساتھ سونے کے لئے لڑا کرتے۔ انہیں سونگھنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ بھینی بھینی تازہ کھدی ہوئی مٹی کی سی مہک آتی تھی۔ کئی دن غائب رہنے کے بعد جب دور سے ان کے گانے کی آواز سنائی دیتی تو ہم لوگ پاگلوں کی طرح غل مچاتے دوڑتے، چیونٹیوں کی طرح لپٹ جاتے اور انہیں گھسیٹ لاتے۔ وہی آواز جسے سن کر روح فنا ہوا کرتی تھی پھر لحنِ داؤدی کا اثر کرنے

گئی۔ ان کے آتے ہی گھر کی فضا جاگ کر کھلکھلا اٹھتی۔ ڈھول ٹھمکنے لگتا۔

"ہو مورے راجہ۔ دلی سے بید بلا نا۔

سیج ہمری دیکھے دھیرے دھیر۔" وہ نئے گیت نئی دھنیں سناتیں۔

"ساون آئے گو ابھائی کا جھولا نہ پڑے۔"

گھٹائیں جھوم کر آتیں، پھواریں پڑتیں، جوان دلوں میں امنگیں انگڑائیاں لینے لگتیں۔ قدسیہ خالہ کی آنکھوں میں چنگاریاں سلگنے لگتیں۔ جھولا کون ڈالتا، قدسیہ خالہ کو تو جھولا جھولتے دیکھ کر چکر اور متلی شروع ہو جاتی۔ مگر بوا کسی کے گھر سے رسی اٹھا لاتیں۔ ہم رسی پر تکیہ رکھ رکھ کر جھولتے۔ بوا لمبی لمبی تانیں اٹھاتیں۔ ان کے ساتھ پلنگڑی پر لیٹی قدسیہ خالہ بھی آواز ملانے لگتیں۔

"جیا ترسے بدروا برسے

سکھی ری دن کیسے کٹیں گے بہار کے۔"

شبیر ماموں دور بیٹھے مجرموں کی طرح فرش کو گھورتے جیسے وہی بادل برسا کر کسی کا جی ترسا رہے ہیں۔ اور قدسیہ خالہ کی زندگی کی بہار کے دن جو کٹھن بیت رہے ہیں اس کی ذمہ داری انہیں پر آتی تھی۔ قدسیہ پرائی تھیں۔ وہ تو شجر ممنوعہ تھیں۔ چپکے چپکے مولویوں سے فتوے لئے۔ وکیلوں سے بات چیت کی۔ مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب خلع بل پاس نہیں ہوا تھا۔ پہلے تو خاندان کی ناک کٹنے کے ڈر سے طلاق کا خیال بھی کسی نے نہ کیا، پھر جب خاندان کے کچھ باغی لوگوں نے نانی بیوی کو راضی کیا تو

قدسیہ خالہ کے دولہا کو ضد سوار ہو گئی۔ بُوا نے اپنی ایک آزاد دنیا بنالی تھی جہاں وہ دنیا کو ٹھوکر مار کے راج کرتی تھیں۔ مگر آخر کو عورت تھیں۔ لاکھ دروازے بند کئے پھر بھی کوئی جھری رہ گئی۔ ہمیں وہ واقعی اچھی لگتی تھیں۔ ان سے پیار بھری ضدیں کرتے۔ وہ جاتیں تو ماتم کناں پیچھے لگ جاتے۔ ناچار لوٹ آتیں۔

"بوا یہ بچے تو تمہارے پیچھے دیوانے ہو گئے ہیں۔ ان کم بختوں کو بھی اپنے سنگ لے جاؤ۔" اور بُوا اپنا دورہ ملتوی کر دیتیں۔ بُوا پاگل نہ ہوتیں تو سونے میں تولنے کے قابل تھیں۔ کام کاج میں بھی ہاتھ بٹانے لگی تھیں۔ صفائی کا انہیں جنون تھا۔ بچوں کی فوج لے کے جدھر پل پڑتیں ٹوکروں کوڑا نکال پھینکتیں۔ ابا کی پنشن کے بعد وطن چلی چلیں تو کیا کہنے۔

"کیا اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔" اماں نے حکیم صاحب قبلہ سے پوچھا جو قدسیہ خالہ کا علاج کیا کرتے تھے اور دوسرے تیسرے آتے رہتے تھے۔

"ہو کیوں نہیں سکتا بیگم صاحب! دنیا میں کون سا ایسا مرض ہے جس کا طِب میں علاج نہیں۔ مسہل دیئے جائیں انشاءاللہ دماغ صحیح حالت پر آجائے گا۔"

حکیم صاحب قبلہ کے پاس ہر مرض کی بس ایک دوا تھی، املتاس کے جلاب! جب قدسیہ خالہ کو بہت وحشت ہوتی تو یہی جلاب دیئے جاتے۔ ان جلابوں سے جان کے ساتھ جسم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھنے کا یقین

ہونے لگتا۔ روبصحت ہونے کے سوا بے چاری کو کوئی صورت نظر نہ آتی۔ پھر کافی دن تک وہ پلک جھپکاتے بھی ڈرتی تھیں کہ لوگ اسے دورہ سمجھ کر کہیں علاج پر نہ تل جائیں۔ چچا میاں کو بھی دردِ گردہ کے لئے وہی جلاب دیئے گئے۔ پہلی خوراک کے بعد وہ حکیم جی کو قتل کرنے کے ارادے کرنے لگے۔

''جسم کی گرمی دماغ پر چڑھ جاتی ہے۔ پیٹ کی صفائی سے تمام فاسد مادّے خارج ہو جاتے ہیں۔'' وہ مسہل کے فوائد بیان کرتے اور ہر کوئی قائل ہو جاتا۔ مگر بُوا سنی ان سنی کر دیتیں۔

''ارے رہن دیو۔ ای بید کا بچہ کا ہمرا علاج کر ہنے۔'' ان کی بیماری پر زیادہ بحث بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایک دم اکتا کر بھاگ کھڑی ہوتیں۔

بُوا کے علاج کی بات چل ہی رہی تھی کہ ایک دردناک واقعہ پیش آیا کہ ان کا پاگل پن کھل گیا۔ سنجھلی بے چاری ذرا مسمسی سی تھی۔ اس کی شادی میں مستقل اڑچنیں پڑا کرتی تھیں۔ بڑے جوڑ توڑ کے بعد سہارنپور والی خالہ بی ایک پیغام گھیر کے لائیں۔ دولہا کی اماں بات چیت کے سلسلہ میں آئیں۔ ان پر رعب ڈالنے کے لئے گھر اتنا جھاڑا پونچھا گیا کہ ہم خود اپنے گھر میں مہمان سے لگنے لگے۔ ہر طرف ایسی چیزیں سجا دی گئیں جن کے میلے ہو جانے اور ٹوٹنے کے ڈر سے ہر وقت ڈانٹ پڑتی۔

بُوا کئی دن سے غائب تھیں۔ ہم انہیں تین چار دن رو پیٹ کے ناامید ہو چکے تھے۔ ہونے والی سمدھن کے لئے نہایت لمبا چوڑا دستر

خوان چنا جارہا تھا، بیلے کی کلیوں کا گچھا آنچل میں جھلاتی، کوئی نیا گیت مُرمُراتی حسب عادت اچانک آگئیں۔ پہلے تو گھر کے سولہ سنگھار دیکھ کر ٹھٹکیں، پھر سمدھن کو دیکھ کر ایک دم الف ہو گئیں۔ ان کے بہت قریب جاکے آنکھیں مچمچائیں، بھنویں سکیڑیں جیسے کوئی بہت باریک سی جوں ڈھونڈ رہی ہوں۔ حالانکہ سمدھن خاصی واضح تھیں۔ ٹھنگنی تو ضرور تھیں مگر قد کی لمبائی کی کمی چوڑائی میں پوری ہو گئی تھی۔ بُوا کے رویہ سے اماں ذرا گھبرائیں۔ ان کا دھیان بٹانے کے لئے اِدھر اُدھر کی فضول باتیں کرنے لگیں۔ مگر بُوا نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا اور سمدھن سے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"اے بہنی، کون چکی کا پسا کھات ہو؟"

سمدھن کے چہرے پر بہت سے عضلات پھدکنے لگے۔ سیاہ اور چکنی ناک میں ہیرے کی لونگ بھڑکنے لگی اور ایسا لگا سمدھن ایک دھماکہ سے پھٹنے والی ہیں۔

"اے بُوا ذرا یہ برف کا پانی مردان خانہ میں لے جاؤ۔" انہوں نے بُوا کو گھسیٹ کر سمدھن کی جان بچائی۔ "سنجھلی کا پیغام آیا ہے۔ دولہا باہر بیٹھا ہے۔ ذرا دیکھ کر تو آؤ کیسا ہے۔" اماں نے پھسلا کر انہیں باہر بھیج دیا۔

"نگوڑی سِڑن ہے۔" اماں نے معذرت چاہی۔

مگر سمدھن کبیدہ خاطر ہو گئیں۔

بُوا گئیں، اور الٹے قدموں لوٹ پڑیں۔ برف کے گلاسوں کی

کشتی انہوں نے دھم سے چوکی پر پٹخی اور ماتھا کوٹنے لگیں۔ ''اے موری میا۔ ای ڈلہا ہے کہ تمباکو کیر پنڈا۔ اوپر سے بیت بھر کا۔'' انہوں نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر بائیں ہاتھ کا بالشت بنا کر کھڑا کیا۔ ''بھائی ای جوڑی تنکو ٹھیک نہیں۔ ڈلہا کوئی کام کا نہیں۔ کاہے بٹیا کا نصیب پھوڑت ہو۔ اے سمدھن کوئی اپنی سکل کی پری جات ڈھونڈ کر لاؤ پوت کے لئے۔ ہمری بٹیا کا بکسو۔''

سمدھن پیٹیں تو نہیں لیکن سنجھلی کو اسی وقت بخش دیا۔ بُوا انہایت خفا گیاتی رہیں۔ اماں کے قابو میں خاک آتیں۔ کھونٹی سے ڈھول اتار کے کھرواتال اڑانے لگیں۔

''کالا بلم ہم نا لئے دیدی۔ کالا بلم
جب مورے سیاں سیجوں پہ آئیں ہیں
اس ماروں لات آتان گرے دیدی
کالا بلم...... ہم نا لئے۔''

سنجھلی کے نصیب میں اڑ چنیں ہی لکھی تھیں۔ سارے گھر نے بُوا کی ٹانگ لی۔ مگر ڈھول لڑھکا کے وہ بڑبڑاتی چلی گئیں۔

''کوّاں ماں ڈھکیل دیو دھی کا۔ ہاں۔''

ہفتوں کے لئے غائب ہو گئیں۔ ایسا لگا جیسے اب کبھی نہیں آئیں گی۔ گھر میں سونا پڑ گیا۔ قدسیہ خالہ کے دورے پھر جلدی جلدی وارد ہونے لگے۔ مزاج بھی بہت جھلا ہو گیا۔ پہلے تو ہر بات نانی بیوی کی مان لیتی تھیں۔

"اے بیٹی قدسیہ ذرا سا دودھ پی لو۔"

"اچھابی اماں۔"

"بیٹی اب لیٹ جاؤ کب سے کھونٹا سی بیٹھی ہو۔"

"اے ہے کب تک پڑی رہو گی۔ اب اٹھ بیٹھو۔"

غرض اٹھو بیٹھو، کھاؤ پیو۔ نانی بیوی کی جان کو قدسیہ خالہ روگ کی طرح لگ گئی تھیں۔ ہر وقت انہیں کا ماتم! ہر دم نگاہیں انہیں پر جمی رہتیں۔ اس کے سوا کام ہی کیا تھا اُنہیں۔ قدسیہ خالہ ہر بات پر "اچھابی اماں" کہے جاتیں۔ ایکا ایکی نہ جانے کیوں نانی بیوی کو جھڑ کنے لگیں۔ دونوں میں تو تو میں میں ہونے لگتی۔ کبھی قدسیہ خالہ روتیں کبھی نانی بیوی۔ بیچ میں دادی اماں پھاند پڑتیں۔ ایک ایک کر کے سب لپیٹ میں آجاتے۔ دو پارٹیاں بن جاتیں۔ بات کہیں سے شروع ہو کے کہیں ختم ہوتی۔ ددھیال اور ننھیال دو کیمپ بن جاتے۔ سات پیڑھی تک حملے ہونے لگتے۔ پھر منھ تھو تھائے سب ایک دوسرے سے تنے رہتے۔

سب لڑائیاں قدسیہ خالہ کے مورچہ سے شروع ہوتیں۔ دن بدن ان کی طبیعت میں تلخی بڑھتی جارہی تھی۔ خوب لوگوں کے دل دکھتے اور انہیں مزا آتا۔ شبیر ماموں سے بھی وہ کھنچی کھنچی رہنے لگیں۔

"میری بار کیوں اتنی دیر کری۔" وہ قدسیہ خالہ کی دل پسند چیز سنانے لگے تو وہ پیٹھ موڑ کر پڑ گئیں۔ بے چارے منمنا کے رہ گئے۔

"جایئے نا، پھر رات ہو جائے گی۔ برسات کا زمانہ ہے۔" وہ رحم

کھا کر رکھائی سے کہتیں اور وہ کچھ احسان مند سے اٹھ کر چلے جاتے۔ خیال تو ہو ااُن کا۔

پھر ایک دن ہم خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ وہ ہمیں مل گئیں۔ بہار کا موسم تھا۔ جنگل ٹیسو کے پھولوں سے دہک رہے تھے۔ آنکھوں میں لال لال رنگ بھرا جاتا تھا۔ وہ ایک انگاروں سے لدے درخت کے پاس رک کر اپنی سلیپر سے ریت جھاڑ رہی تھیں۔ گلابی دوپٹہ پھولوں کے عکس سے آتشیں ہو رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بہاریں رقصاں تھیں، جیسے اپنے محبوب سے مل کر آئی ہوں یا ملنے جا رہی ہوں۔

ہم لوگ اُن پر ٹوٹ پڑے۔ محبت انسان کو کتنا بے بس کر دیتی ہے۔ ہماری بے قراری پر وہ کھل اٹھیں۔ گلے میں موتی بجنے لگے۔

"ارے بھائی چلت ہیں، تنک دم تو لیوَ۔" ہم انہیں گھسیٹنے لگے۔ ایک بار انہوں نے پیچھے ٹھٹک کر دیکھا۔ اور بڑی لجاجت سے کہا۔

"ابے لوٹ کے آوت ہیں!" ہم بوکھلائے، وہ کس سے ابھی لوٹ کر آنے کا وعدہ کر رہی تھیں۔ وہاں تو کوئی بھی نہ تھا! چلیں پھر رک گئیں۔ پھر بگڑ کر بولیں۔ "ہم سے نکھرے نہ کرو ہاں! ہم کہے دیت ہیں۔" پھر چلنے کو مڑیں مگر پھر جیسے کوئی ناگوار بات سُنی اور تیور چڑھا کر زور سے ڈانٹ کر بولیں۔ "اچھا جاؤ نہ آویں گے۔ دیکھت ہیں تم ہمرا کا کر لیت ہو۔ ہمرا اعتبار ناہیں کرت ہو...... ہمری بلا سے۔" وہ ہوا سے لڑ رہی تھیں اور اپنی ٹانگوں کا یہ حال تھا کہ بہی جاتی تھیں۔ اگر ہم واقعی انہیں اتنا نہ

چاہتے ہوتے تو کبھی کے بھاگ کھڑے ہوتے۔

بوا کے آنے سے کائیں پائیں مچ گئی۔ نہ جانے کیا اتفاق تھا کہ جب وہ آتیں تو یا تو کوئی پھلوں یا مٹھائیوں کا پارسل آجاتا یا کوئی اچھی سی خبر آتی۔ انہیں دیکھ کر سب کے دل چونچال ہو جاتے۔ لڑائی ہو رہی ہوتی تو ختم ہو جاتی یا غل غپاڑے میں لوگ بھول جاتے۔ قدسیہ خالہ اپنی نامرادی جھٹک کے اٹھ بیٹھتیں۔

باتیں کرتے کرتے بوا ایک دم تیوریاں چڑھا کر سپاٹ دیوار کو گھورنے لگیں۔

"جاؤ۔ نہ آویں گے!" انہوں نے ہوا کو ڈانٹا۔ سب سہم گئے۔

"کیا ہوا؟" اماں نے پوچھا۔

"بھائی ہمرا مگج کھائے گوا۔ ہم پر بھروسہ نہیں۔ بہت ہے ہمری آسنائی ہے! ہم نین لڑاوت ہیں۔" وہ چلا چلا کر بالے میاں کی شکایت کرنے لگیں۔ "ارے ہم کا سمجھت کا ہے؟ ہم کوئی پتریا ہن کھانگی ہن؟"

"اوئی!" اماں اداس ہو گئیں۔۔۔ "ہائے پگلی!" انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"جل کے مُرنڈ ہوا جات ہے۔ کہت ہے ہرجائی ہن!" وہ خیالی محبوب بالکل چوں چوں کا مربہ تھا۔ کچھ جیمس بونڈ اور کرشن مُراری کا مجموعہ سمجھ لیجئے۔ جیمس بونڈ تو زمانہ میں ہیرو رہ چکا ہے۔ وہ چاہے داستان امیر حمزہ کا ہیرو ہو، حاتم طائی ہو یا آلہا اودل کی صورت میں ظاہر ہو۔ اور

کرشن مُراری کی جھلک شاید اس لئے تھی کہ زیادہ تر لوک گیت انہیں کی شان میں ہوتے ہیں۔ بالے میاں بالکل وہی شرارتیں کرتے تھے۔ آنچل پکڑنا، کلائی مروڑ کر چوڑیاں مُرکا دینا اور کبھی غصہ آجائے تو لپڑ مار دینا یا کشتی لوٹ دینا۔ ان میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو ایک طرحدار نوجوان میں ہونا چاہئیں۔ کچھ بھی ہو بُوا کے بالے میاں قدسیہ خالہ کے شبیر ماموں سے زیادہ زندہ اور دلچسپ تھے۔ ہمیں بُوا کی ہر بات یقین آجاتی۔ انہیں میاں دکھائی دیتے تھے تو اس میں تعجب کی کون سی بات تھی۔ ہمیں خود بادلوں میں ہاتھی، گھوڑے اور میلی پرانی نونی لگی دیواروں کے اکھڑے ہوئے پلستر میں اندر سبھا کا اکھاڑہ جما نظر آتا تھا۔ ہمیں تو وہ پاگل بھی نہیں لگتی تھیں۔ اگر ایسے پاگل ہر گھر میں دو چار پیدا ہو جائیں تو زندگی کتنی ہلکی پھلکی ہو جائے۔

"اے بُوا ذرا ادھر آؤ۔" اماں نے مطلب کی بات کہنے کے لئے انہیں پھُسلایا۔ شاید میاں سے خفا تھیں، اس لئے اماں نے جب حکیم جی سے علاج کروانے کی تجویز پیش کی تو بدکیں نہیں۔ ایسا لگا غور سے سن رہی ہیں۔

"ارے اب کا علاج کراویں۔ او کم بکھت ہم کا روگ ایسا لگائے دہس ہے کہ کہ ہم کا کھتم کر دیہے۔ بات بات پر کر کر گرت ہے۔ ہمرے اوپر دھونس جماوت ہے۔" کھونٹی پہ سے ڈھول اتار کر بڑے تاسف سے دیکھتی رہیں۔ "ای چوہیا مال جادی کا ہیجہ سمیٹے۔ چھنال، سب کاٹ ڈارس۔"

جب ڈھول سے ناامید ہو گئیں تو ویسے ہی بالے میاں سے لڑنے لگیں۔

"سیّاں تورے نکھرے ہم نا سہیں گے
ارے تم چڑہیو گھوڑا ہم ہاتھی چڑھیں گے
بلما تورے نکھرے ...."

خوب خوب سیاں کو کھریدا۔ وہ کوٹھا چڑھے تو یہ پہاڑ چڑھیں۔ وہ ان کی ریس میں پہاڑ چڑھے تو یہ پاتال چڑھیں۔ غرض بے چارے کو چیں بلوادی۔

"ارے دیکھت جاؤ۔ آپ ہی جھک مار کے ہمرے پیر پکڑ ہئے۔" انہوں نے بڑے اطمینان اور وثوق سے کہا۔

دیوانے بھی اپنی دنیا کے شہنشاہ ہوتے ہیں۔ معاذاللہ کیا غرور تھا بُوا کو اپنے تیئں پر! شاہوں کے شاہ اُن کے قدم لیتے تھے۔ ان کی ایک مسکراہٹ پر مٹے دھرے تھے۔ ایسا معرکے کا چاہنے والا مل جائے تو ہوش و خرد کی دنیا کو کیوں نہ لات مار دے انسان؟

پنجرے میں بند پرندے، فضا میں اُڑنے والی آزاد چڑیوں کی اڑان دیکھ کر تیلیوں سے سر پھوڑتے ہیں۔ جب نہیں نکل پاتے تو انہیں پھنسانے کے لئے شکاری سے سازباز کرتے ہیں۔ پرندوں کو پھانسنے کے لئے پالتو یا پر کٹے پرندا استعمال کئے جاتے ہیں۔

گھر کی چہار دیواری میں دنیا اور سماج کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی بھلی بیویوں کو بھی بُوا کی یہ آزادی شاق گزرتی تھی۔ عورت ہو کر وہ

مَرد کے حقوق دابے بیٹھی تھیں۔ جو سب کو کھلتا تھا۔ بُوا نے دوا پینے کی حامی تو نہ بھری مگر ہائے توبہ بھی نہ مچائی۔ اماں نے کہا، موئی کی "ہاں" اور "نا" کی بھلی چلائی۔ اُس کے فائدے کے لئے علاج ہو رہا ہے۔

رات بھر بے قلعی پتیلے میں املتاس کی پھلیاں، ہڑ بہیڑا، آملا اور بھی اسی قبیلہ کی مکروہ دوائیں اونٹائی گئیں۔ نانی بیوی نے تہجد کی نماز کے بعد آنچ پھر تیز کر دی۔ بُوا کو پھسلا کر روک لیا گیا تھا۔ صبح سویرے نہار منھ خوراک پینی تھی۔ ہم لوگ بھی جاگ گئے۔ سارا گھر املتاس کی بیک سے سڑ رہا تھا۔ گھلے ہوئے گوبر کے رنگ کی بڑا بادیہ بھر کے، دیکھ کے آنتیں حلق کی طرف اچھلنے لگیں۔

بُوا نے بہت رسیاں تڑائیں مگر اماں نے اپنی جان کی قسمیں دیں۔ نانی بیوی نے "میاں" کا واسطہ دیا۔ انہیں پکڑ کے موری کے پاس اکڑوں بٹھایا گیا۔

"دوپٹے سے ناک پکڑ لو۔" دادی اماں نے رائے دی۔ سارا گھر ٹھٹ لگا کے جمع ہو گیا جیسے مینڈھوں کی لڑائی ہو رہی ہو۔ بُوا نے ناک دوپٹے سے دابی اور تائی اماں کی مدد سے بادیہ سنبھالا۔

"نہ پلاؤ۔ اماں بی۔ ہے ہے آپا بیگم رہنے دو موئی کو۔" ایک دم قدسیہ خالہ سب کے ہاتھ جوڑنے لگیں۔ "اچھی تائی اماں۔" وہ یہ جلاب جھیلے ہوئے تھیں۔

"اے ہے لڑکی دماغ خراب ہوا ہے تیرا......" "ہم سب ناکیں

دبائے موری کے پاس اکڑوں بیٹھے خی خی کر رہے تھے۔

"نہیں تائی اماں۔ اچھی نہ پلاؤ۔ میں پی چکی ہوں اللہ بچائے۔"

"پی چکی ہو اسی لئے تو آپے میں ہو ذرا۔۔۔ نہیں تو بتواب تک تو تنکے چننے لگتیں۔"

بڑے اہتمام سے بُوا نے ایک گھونٹ منہ میں لیا اور پھر سے تائی اماں کی چھاتی پر کلّی کر دی۔ بادیہ موری میں پٹخ وہ بھاگیں نلکے کے پاس۔ مار کلیاں کرتے کرتے اُنتو ہو گئیں۔

"موت اوے ای حرامی بید کا۔ ہم کا اپنی مہتاری کیر کلیجہ پیے کا دے دہس۔" وہ ہر کلّی پر قبلہ حکیم صاحب کو ایک وزنی سی گالی دیتیں۔ "او کی کبر ماں کیڑے پڑیں۔"

"اے ہے۔ اتنی قیمتی دوا موری میں لنڈھا دی۔ نہ پینی تھی تو منہ سے پھوٹتیں۔ قدسیہ کے کام آجاتی۔" قدسیہ خالہ لرز اٹھیں۔

"ارے ہم کہاں پھینکا، اُو ہاتھ مار دیہس!" وہ الزام بالے میاں پر تھوپ کر الائچیاں چبانے لگیں۔

"ان سے تو لڑائی تھی۔" تائی اماں جل کے رہ گئیں۔

"ارے او ایک بدماس ہے۔ اُو سے کون لڑائی کرے۔ رات کا ہمرے پیچھے پڑ گوا۔ ہمرے پیر پکڑ کے روئے لگا۔"

معاذ اللہ!۔

سب کلس کے رہ گئے۔ بُوا نہایت بے تعلقی سے اٹھیں اور چل دیں۔

"اے لو کہاں چلیں۔ سنو"

"ہمکا جاؤ کے کا پڑی۔ پھر کھپا ہو جیہے۔" وہ پیار سے انہیں دیکھتی ہوئی چل دیں۔

"سیاں توری گودی پھُل گیندا بن جاؤں گی۔" سخت ملاپ ہو گیا۔

شہر میں تھیٹر آیا ہوا تھا۔ سب تڑپ رہے تھے، وہ مزے سے بلا ٹکٹ روز جاتیں۔ وہاں سے نئے نئے گیت اڑا کر لاتیں۔ عشق و محبت کے سلگتے ہوئے دعوے۔ قدسیہ خالہ کے طور بھی بدلے نظر آرہے تھے۔ اب وہ راشد الخیری کی "صبح غم" اور "شام زندگی" پڑھ کر ہچکی باندھنے کے بجائے "مثنوی زہر عشق" چھپا کر پڑھا کرتیں اور راتوں کو گھنٹوں صحن میں ٹہلا کرتیں۔

"قبلہ وہ مُردار جلاب ہرگز نہیں پئے گی۔" اماں نے قبلہ حکیم صاحب سے شکایت کی۔

"کوئی مضائقہ نہیں۔ میرے پاس بحمد اللہ اور ادویات ہیں۔ ایسی اُس کے فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلے۔ یہ تین گولیاں پان میں یا مٹھائی میں رکھ کر دے دیجئے۔ تین تین دن کے وقفہ سے۔ انشاء اللہ مکمل افاقہ ہو جائے گا۔"

"لو بُوا پان کھاؤ۔" آتے ہی اماں پٹاری کھسکا کر مصر ہو جاتیں۔

"نا ہیں بھائی ہمرا منھ بکسائے جات ہے۔" وہ صاف کترا جاتیں۔

مگر بیویوں کو سوائے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کے اور کوئی کام ہی نہ ہو تو کوئی کہاں تک بچ سکتا تھا۔ شاید بالے میاں سے کچھ اَن بن ہو گئی تھی یا اُن سے غفلت ہو گئی۔ بُوا کے حلق سے پہلی خوراک اتار دی گئی۔ اور لوگ اثر ہونے کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ مگر بُوا کو کچھ نہ ہوا۔ اتنا ضرور فرق ہوا کہ ہم نے انہیں کبھی اس دن سے پہلے سوتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نیم کے نیچے کھاٹ ڈالے لیٹی تھیں اور سو گئیں۔ سب کو یقین آ گیا کہ ضرور بالے میاں نے کوئی تکڑم کی ہو گی کہ گولی پھُس ہو گئی۔ یا شاید نہار منہ نہیں دی گئی اِس لئے اثر نہ ہوا۔ بُوا ایک دم ہڑ بڑا کے اٹھیں۔ اس دن سے پہلے ان کے چہرے پر ایک عجیب سا انجانا خوف کبھی نہ دیکھا تھا۔ واقعی وہ غیب داں تھیں۔ کچھ غصہ میں اٹھ کر چلی گئیں۔

''اے ہے۔ بھئی خاک ڈالو موئے علاج پر، کہیں کوئی اُلٹی سیدھی بد دعا لگ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ پہنچے ہوئے لوگوں سے الجھنا ٹھیک نہیں۔'' اماں نے فیصلہ کیا۔

''حیرت کا مقام ہے کہ موئی ٹس سے مس نہ ہوئی۔'' نانی بیوی نے مان لیا۔

مگر شام کو حیرت کے مقام ڈھے پڑے۔ بُوا کی چمارن بھاگی آئی کہ بُوا کو صبح سے دست لگے ہوئے ہیں۔ اب الٹیاں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ اماں نے بوکھلا کر قبلہ حکیم صاحب کے پاس آدمی دوڑایا۔

''گرمی نکل رہی ہے۔'' قبلہ حکیم صاحب نے فرمایا اور کوئی عرق

دیا جس سے گرمی نکلنے میں ذرا کمی ہوئی مگر بھینسوں بخار چڑھ گیا۔

کئی دن اماں بلاتی رہیں مگر وہ نہ آئیں۔ وہ پہلے ہی کیا بہت کھاتی تھیں۔ چمارن آکر ان کے لئے پتلی کھچڑی یا ساگودانہ لے جاتی مگر وہ ہاتھ بھی نہ لگاتیں۔ بس پانی پیے جاتی تھیں۔

ہفتوں بعد آئیں تو ہمیں ایسا لگا وہ ہم سے ذرا دور ہو گئی تھیں۔ جیسے ہم تو بچے ہی رہ گئے اور وہ سیانی ہو گئیں۔ ہم ان کے گلے میں جھولے تو تیورا کر بیٹھ گئیں۔

"ای کا مسکری کرت ہو۔" وہ ترش روئی سے بولیں۔ گویا اس سے پہلے ہم ان کے گلے کا ہار کبھی نہ بنتے تھے۔ ان کے کپڑے بھی مسلے ہوئے تھے۔ بال خشک اور الجھے ہوئے۔ پہلے ہی دبلی پتلی تھیں۔ اب اس جھٹکے میں اور بھی گئی گزری ہو گئیں۔ ہم لوگوں نے ان سے ڈھول مڑھوا دینے کی فرمائش کی تو ٹال گئیں۔ اماں نے ان کے آگے مٹر کی پھلیوں کی سینی سرکا دی۔ بیٹھی چھیلتی رہیں۔

نانی بیوی اور اماں میں اوپر ہی اوپر اشاروں میں باتیں ہوئیں۔ دونوں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ اگر باقی کی دو گولیاں اور پہنچ گئیں تو مرض کا نام و نشان بھی نہ رہے گا۔

"کہو بُوا میاں سے تو ان بن نہیں۔" اماں نے ٹٹولا۔

"کوئی ہم جھگڑا کرت ہیں؟" اس کا مطلب جھگڑا چل رہا تھا۔ "او نہ جانے اپنے کو کا سمجھت ہے۔ بڑا آوا لاٹ صاب کیر بچہ۔" وہ جُز بُز ہو

گئیں۔ ناچاقی ضرور ہو گئی تھی۔

اُن کی چمارن کہیں پاس کے گاؤں میں زچگی کرانے گئی ہوئی تھی۔ ویسے تورسیاں بٹا کرتی تھی۔ سائڈ بزنس کے طور پر ضرورت مندوں کی حاجت پوری کر دیتی۔ اماں نے روک لیا کہ رات یہیں رہ جاؤ۔

اماں حلف اٹھانے کو تیار تھیں کہ حاشا انہوں نے دوسری خوراک نہیں دی۔ مگر دادی کہے جا رہی تھیں کہ بہو اور سمدھن میں مسکوٹ ہو رہی تھی۔ ضرور دوادی گئی جو کہ تیزابی بم ثابت ہوئی۔ مارے اجابتوں کے بُوا ڈھیر ہو گئیں۔ رات کو تو ایسی لے دے پڑی کہ ابا تک بات پہنچ گئی۔ ڈاکٹر آیا۔ اس نے دوادی مگر وہ صبح تک ہلکان ہوتی رہیں۔ ابا خوب گرجے کہ حکیم صاحب قبلہ کی خوب جوتے کاری ہونا چاہئے بالکل چوپٹ ہیں اور اگر آئندہ کسی کو دوادی تو ہتھکڑیاں ڈل جائیں گی۔

دادی اماں کو کچھ اس کارِ خیر میں دلچسپی نہیں لینے دی گئی تھی۔ نانی بیوی کا کیس تھا اور وہ خود مورچے پر رہنا چاہتی تھیں۔

"اے بیویو کیا ہو رہا ہے۔" دادی بہری بھنڈ تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہ جملہ دہرا دیتی تھیں۔

"کچھ نہیں بہن، ہوتا کیا۔ تمہارا سر!" نانی بیوی جملہ کا پہلا ٹکڑا زور سے اور آخری نہایت چپکے سے ادا کرتیں۔

"ہمیں تو بھئی کوئی کچھ بتاوے ہی نہیں ہے۔" دادی اماں بسورتیں۔ دونوں میں ہمیشہ چلتی ہی رہتی تھی۔ سمدھنیں بھی تھیں اور

رشتے میں نند بھاوجیں بھی لگتی تھیں۔ مگر اصل نفاق کی بنیاد دونوں کے عقائد تھے۔ نانی بیوی پکی سنت جماعت اور دادی اماں شیعہ۔ دونوں کی چھاؤنیاں مختلف بر آمدوں میں تھیں۔ نانی بیوی کے بر آمدے میں صبح سے اماں آ کے بیٹھ جاتیں۔ اماں وہ محور تھیں جن کے گرد گھر کی دنیا گھومتی تھی۔ ظاہر ہے ان کے بر آمدے کو زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی۔ اماں، دادی اماں کو سلام کر کے ادھر ہی آ بیٹھتیں۔ قدسیہ خالہ کے کمرے کا دروازہ ان کے بر آمدے میں ہی تھا۔ قدسیہ خالہ جو خاندان کا نہایت اہم اخلاقی مسئلہ تھیں۔ ان کے دوروں سے خوب چہل پہل تھی۔ پھر شبیر ماموں بھی اِدھر ہی آ کے بیٹھتے تھے۔ اور بچے تو وہیں ہوں گے جہاں غل غپاڑہ ہو۔ دادی اماں کلستی تھیں۔ ددھیال کے ناطے بچوں کو شیعہ ہونا چاہئے تھا مگر نانی کا سکہ چلتا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے سنت جماعت کا پرچار کرتیں۔ اماں کی پشتی حاصل تھی۔ وہ دادی اماں کا کہنا ماننے پر مسکرا کر ڈانٹتیں اور ہم شیر ہو جاتے۔ مگر نانی بیوی کا کہنا نہ سنو تو ہڈیاں توڑنے کے وعدے کئے جاتے۔

دونوں طرف سے ہمیں صراطِ مستقیم دکھا کر جنت میں لے جانے کی کوششیں ہوتیں۔ ایک کلمہ دادی اماں سکھاتیں تو نانی اماں سنت جماعت کا کلمہ سکھاتیں۔ گڑ بڑا کر ہم دونوں کی کھچڑی بنادیتے اور قبلہ حکیم صاحب کی تیر بہدف گولیوں کا سا اثر ہوتا۔ ذہنی جلاب والی کیفیت تھی۔ بہشت کے دروازے کی چابیاں خلط ملط ہو جاتیں اور دونوں طرف سے کفر کے فتوے ملنے لگتے۔ نانی بیوی، دادی اماں کی مجلسوں کی چوٹ پر میلاد

شریف کرتیں۔ مٹی کے سکوروں میں نکتیاں ملتیں۔ ہم فوراً کٹر سنی ہو جاتے۔ مگر جب دادی اماں کے برآمدے میں جھاڑ فانوس پر سے تھیلیاں اتاری جاتیں اور خضری رکھی جاتی تو ہم قطعی اُن کے ہو رہتے۔ جب لرزتی آوازوں میں نوحے پڑھے جاتے تو ہم کالے کرتے پہن کر خوب ماتم کرتے۔ نانی بیوی دھموکے لگاتیں اور رنگ برنگا کٹکا دے کر پھسلانا چاہتیں۔ مگر محرم شریف کے مہینے میں دادی اماں کی پارٹی میں رہنا زیادہ مفید ثابت ہوتا تھا۔ ہمارے لئے ادھر ہی جنّت کے دروازے کھل جاتے جدھر تر مال زیادہ ہوتے۔

"کیوں ری تو سنّن ہے کہ شیعہ۔" دادی اماں عموماً پوچھا کرتیں۔

"شیعہ۔" ہم مستعدی سے جواب دیتے۔

"اری راوضی ہے کہ سنّت جماعت۔" نانی بیوی بھی عموماً مٹھائی بانٹنے سے پہلے پوچھتیں۔ شکر ہے دونوں کیمپ دور دور تھے اور دونوں کچھ اونچا سنتی تھیں۔

بُوا کے علاج کا سوال کافی تلخ صورت اختیار کر گیا۔ دادی اماں نے ابا کے کان بھرے۔ انہوں نے کچھ کہہ دیا اس پر اماں خوب روئیں۔

ابا کی پنشن کا زمانہ قریب آ رہا تھا۔ خوش حالی کے زمانے میں دل وسیع ہو جاتے ہیں۔ اپنوں پر پیار آنے لگتا ہے۔ کال پڑنے پر محبت کے سوتے بھی سوکھ جاتے ہیں۔ ساری عمر للّے تللّے خرچ کیا۔ اب چند سال میں اس فضول خرچی کا انتقام لینے کی فکر پڑی۔ کوا بولتا تو دم نکل جاتا۔ اب

آنے والا ہے کوئی مہمان۔ ہمارے گھر روز ہی کوا بولا کرتا۔ کبھی ددھیال والے چلے آرہے ہیں تو پلڑا برابر کرنے کے لئے ننھیال والے کیوں چوکتے۔ پھوپیاں، چچیاں، تائیاں مع شوہروں اور بچوں کے آتیں تو ماموں، خالائیں بھی کنبہ لے کر آجاتیں۔ مہمان دو مورچوں میں بٹ جاتے۔ دو دستر خوان لگتے۔ جاسوس چھوڑے جاتے۔ دیکھ کر اطلاع دیں کہ مخالف پارٹی کے ساتھ تربتر رعایتیں تو نہیں ہو رہی ہیں۔ عموماً ننھیال پارٹی زیادہ بھاری پڑتی تھی کیونکہ اماں ان کے کیمپ میں ہوتیں۔ ابا کو پارٹی پالیٹکس میں پڑنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ کماتے تھے، اماں خرچ کرتی تھیں۔ بالکل وہی پوزیشن تھی جو آج کل امریکہ کی ہے۔ اُن کے سب ہی مسکا لگاتے تھے۔ خواہ کسی پارٹی سے تعلق ہو۔ ابا تو نیوٹرل تھے، دونوں کا مان کرتے۔

صرف چچا میاں تھے جو دونوں پارٹیوں میں لڑائی کروانے کی تاک میں رہتے۔ اماں جان کہ ددھیال والوں کی زیادہ خاطر کرتیں مگر ایسے کہ صاف غیریت کی بُو آتی۔ اگر کوئی کھانا کم ہوتا تو بہ آواز بلند اس کا اعلان کرتیں۔

"اُدھر بھجوادو، ہم لوگ تو چٹنی اچار سے بھی کھالیں گے۔"

مگر چچا میاں ایک کائیاں۔۔۔ وہ ننھیال پارٹی کے ساتھ کھانا کھاتے مع اس نایاب کھانے کے جو کم پڑ گیا ہوتا۔ پھر جا کر ددھیال پارٹی کے سامنے کہتے۔

"بھئی آج کلیجی گردے لاجواب پکے تھے۔" "کلیجی گردے بالکل نہیں پکے تھے۔

"اے ہے! کتنے دنوں سے جی کر رہا ہے۔ ذرا سے اِدھر نہ بھیجے، سب اُدھر ہی زہر مار کر لئے۔"

پھر دوسرے دن جب کچہری سے لوٹ کر ابا انہیں سلام کرنے جاتے تو وہ فوراً کلیجی گردے کی شکایت کرتیں۔ ابا اماں سے کہتے۔ "بھئی کلیجی گردے اُدھر کیوں نہ بھجوائے؟"

"لو اور سنو! اے کلیجی گردے کب پکے تھے؟" اماں بگڑ کھڑی ہوتیں۔

"اے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ بکریدن ڈونگا بھر کے لے گئی۔" چچا میاں کا بھروسہ کر کے دادی اماں قسم کھاتیں۔ خوب حلف اٹھتے۔ ایمان بیچ میں گھسیٹے جاتے۔ پھر چچا میاں کو بلایا جاتا۔ وہ معصوم صورت بنا لیتے۔ "کیسے کلیجی گردے! بھئی کتنی بار کہا کہ چاولوں کے ساتھ تربوز نہیں ہونا چاہئے میرے گردے میں بے کلی ہو رہی ہے۔ درد شروع ہو گیا تو......" چچا بات پلٹتے

"ادھر کلیجی گردے کھائے تم نے؟" تائی اماں ڈٹ جاتیں۔

"کب؟ بھئی ہمیں نہیں ملے۔ یہ زیادتی ہے۔ ترمال پکتے ہیں اور لوگ ڈکار جاتے ہیں۔" کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا جھگڑا ہے۔ ایک دوسرے کی گواہیاں دلواتا۔ پھر کوئی دکھی دل رو پڑتا۔ ادھر سے جواب میں

کوئی شروع ہو جاتا۔ پرانے زخم تازہ کیے جاتے۔

"میں نے ذرا چوہے دتیاں منگوائیں تو صاف ٹال گئیں۔"

"وہ زور کا طمانچہ مارا انگوڑے کو کہ پورا پنجہ اتر آیا۔"

"اے بہن اپنوں کی بات اور ہے......"

"ہاں بھئی ہم تو دشمن ہیں۔"

جب خوب سب ہلکان ہو جاتے تو چچا میاں سب کو ڈانٹتے۔ "کیا کنجڑوں قصائیوں کی طرح لڑا جا رہا ہے۔ یہ بھی کوئی شرافت ہے۔۔۔ واللہ بوٹی بوٹی پر کتوں کی طرح لڑائی ہوتی ہے۔"

ان کے ڈانٹنے پر سب تھکے ہارے نادم ہو کر سو جاتے۔ ددھیال والے خوش تھے کہ ننھیال پارٹی پر بُوا کے بارے میں جوتے پڑے۔ بُوا بہت بیمار پڑیں۔ تیسری خوراک کی نوبت ہی نہ آئی۔ دوسری خوراک نے انہیں کوئی کام کا نہ رکھا۔ اگر قیس کو قبلہ حکیم صاحب کی تین خوراکیں دے دی جاتیں تو یقیناً وہ مجنوں نہ بننے پاتا۔ نہ اُس میں صحرانوردی کا دم رہتا، نہ لیلیٰ لیلیٰ پکارنے کی کلیجہ میں طاقت رہ جاتی۔ حضرت عشق کی چوکڑی بھول جاتے۔

بخار اترنے کے بعد بھی کئی دن بُوا کے منہ سے مارے نقاہت کے بات نہ نکلتی تھی۔ کیونکہ دوسری خوراک فی البدیہہ کارگر ثابت ہوئی تھی، اس لئے وہ ہمارے ہاں ہی تھیں۔ وہ دن رات خاموش، آنکھیں موندے پڑی رہتیں۔ گئے حواس واپس لوٹ آئے تھے اور کافی سمجھدار ہو

گئی تھیں۔ اُن کی چمارن جا کے بیٹھ رہی تھی۔ اماں ان کے بے انتہا لاڈ کرتیں۔ اپنے ہاتھ سے شوربہ بنا کر دیتیں۔ مگر وہ منہ بنائے پڑی رہتیں۔ بڑی خوشامدوں سے دو چار گھونٹ پی لیتیں تو یا تو الٹی ہو جاتی یا پھر بیت الخلاء کے پاس کھاٹ پڑ جاتا۔ ان کا معدہ مستقل خراب رہنے لگا۔ بغیر دوا کے ہی گرمی نکلا کرتی۔

"کہاں چلی گئیں بُوا؟" ہم کبھی کبھی سوچتے۔ "وہ اکڑتی ہوئی مغرور بُوا۔ بچوں کے ساتھ جامنیں جھاڑتی، کھیتوں سے خربوزے اور ککڑیاں چراتی ہماری پاگل بُوا! اللہ نے انہیں عقل کیوں واپس دے دی۔ وہ ہنسنا بھی بھول گئیں۔"

اور گانا۔۔۔؟ دوسری خوراک کے بعد ان کا گلا بیٹھ گیا۔

اللہ اب وہ کبھی نیم کے پیڑ میں جھولا ڈال کر ساون اور کجریاں نہیں گائیں گی؟

اماں ان کی مختارِ عام بن بیٹھی تھیں۔ انہوں نے ان کا مکان کرائے پر اٹھا دیا اور بُوا مستقل ہمارے یہاں رہنے لگیں۔ چمارن واپس لوٹی تو ماتم کرتی بُوا کے پاس آئی۔ بُوا کی صحت نسبتاً اچھی تھی۔ بیٹھی بھرتے کے لئے اُبلے ہوئے آلو چھیل رہی تھیں۔ سردیاں شروع ہو گئی تھیں اس لئے زیادہ تر وہ باورچی خانہ میں ہی بیٹھی رہتیں۔ ایک زمانہ تھا جب کڑکڑاتے جاڑوں میں بُوا ایک ہلکی سی دوہر اوڑھے راتوں کو گھومتی پھرتی تھیں۔ مگر جب تو ان میں گرمی تھی۔ اماں نے چمارن کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ بُوا چپ

گردن موڑے بیٹھی رہیں۔ مکان کا کرایہ جمع کر کے اماں نے بُوا کے لئے کڑے بننے کو دیئے تھے۔ جب کڑے بن کر آئے تو بُوا نے سونے کے شیروں کے منہ والے کڑے الٹ پلٹ کر دیکھے اور واپس دے دیئے۔

"رکھ لیو۔"

"اے ہاتھ میں ڈال کے تو دیکھو۔" نانی بیوی نے زور دیا۔

"ناہیں بھائی۔ کڑے پہننے کا کون موکا ہے۔" وہ ترشی سے بولیں۔

اب تو بُوا موقع محل بھی پہچاننے لگی تھیں۔

"دیکھو، کون کہے گا کہ یہ نگوڑی پاگل تھی۔ کیسا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے مزاج میں!" نانی بیوی ان کے مرگھلے پن کو ٹھہراؤ کہتی تھیں۔

بالے میاں کا کبھی ذکر نہیں کرتیں۔ ہم کبھی پوچھتے "بُوا میاں کیسے ہیں۔" تو وہ ایسے اجنبی بن جاتیں جیسے وہ ان کے کبھی کوئی نہ تھے۔ انہیں پہچانتی تک نہیں۔ ہم اور چھیڑتے۔

"ہمرا مگج نہ کھاؤ۔" وہ جھلا کر کہتیں اور اماں ہمیں ڈانٹ کر بھگا دیتیں۔

"اے ہے اُسے یاد نہ دلاؤ موئی کو۔ پھر بورا جائے گی۔" نانی بیوی ڈانٹتیں۔ مگر خود شرارت سے چھیڑتیں۔

"اے جان پڑتا ہے تمہارے غازی میاں تمہیں بھول گئے!" بُوا جیسے بہری ہوں، گم بیٹھی رہتیں۔

صرف ایک دن ذرا اُن کی طبیعت چونچال تھی۔ بد پرہیزی نہ

کریں تو سب کھانا ہضم ہو جاتا تھا۔ اب وہ گھر کا کام کافی سنبھال چکی تھیں۔ ہلکے پھلکے کام سے اب وہ ہانڈی بھی بگھارنے لگیں۔ پانچ سیر دو وقت آٹا گوندھتیں۔ پھر روٹیاں بھی ڈالنے لگیں۔

"اُو تو ہر جائی ہے!" بُوا نے ذرا تنک کے کہا۔ ذرا جوش میں آ گئیں۔ نہا کر بیٹھی بال سکھا رہی تھیں۔ کچھ کچھ پرانی بُوا سی لگ رہی تھیں۔ ایک دم مَری سی آواز میں گانے لگیں۔

"ہو راجہ جی۔ سوتن کے لمبے لمبے کیس

اُلجھ مت رہنا۔ ہو راجہ جی"

ان کے لہجے کا وہ وثوق غائب تھا۔ بالے میاں ان سے بے وفائی کر گئے تھے یا کرنے جا رہے تھے۔ انہیں اپنے چھدرائے ہوئے بال دیکھ کر سوتن کے لمبے کیسوں سے ڈر لگ رہا تھا۔

"ہو راجہ جی...... سوتن کے گورے گورے گال۔" بُوا کا سانولا سلونا رنگ مَیلا اور گدلا ہو گیا تھا۔ یکایک بوڑھوں کی طرح جھک کر رہ گئی تھیں۔ اُٹھتیں تو گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر۔ وہ تڑک بھڑک ایک سرے سے غائب ہو گئی تھی۔ بالے میاں کا پیار تج کر وہ لنڈ منڈ اور اُجاڑ ہو کر رہ گئیں۔

بچپن کسی کا ماتم نہیں کرتا۔ انہیں گھسٹتا چھوڑ کر ہم آگے بڑھ گئے۔ قدسیہ خالہ پہلے سے بہت بدل گئی تھیں۔ بجائے ہر وقت ہم لوگوں کی چیخ پکار کی شکایت کرنے کے وہ ہمیں خود بلا کر ہمارے جھگڑے چکاتیں، سبق یاد کرواتیں۔ سردی سے پھٹے ہوئے ہاتھ پیر مانجھ کر ویسلین لگاتیں۔

یا تو کبھی وہ ادھ موئی بسوری پڑی رہا کرتی تھیں۔ کئی کئی دن کنگھی نہ کرتیں، کپڑے چیکٹ ہو جاتے، بدلنے کا خیال نہ آتا۔ جس کا دیکھنے والا ہی آنکھیں پھیر لے تو وہ سہاگن پھر کس کے لئے سنگھار کرے۔ سہاگ کی مروّت میں دو دو کانچ کی چوڑیاں ضرور ڈالے رہتی تھیں۔ لوگ ان کے صبر اور وفا کے محفلوں میں قصے سنا سنا کر جھوما کرتے تھے۔

مگر ایک دم ان میں بڑی نرم و نازک سی تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ آنکھیں بند کئے لیٹے رہنے کے بجائے وہ گھنٹوں چہل قدمی کرتیں۔ رنگ بھی کچھ نکھر آیا۔ شاید اس ابٹن کا اثر ہو جو انہوں نے قسم قسم کے مسالے کوٹ چھان کر تیار کیا تھا۔ نانی بیوی کبھی ان کی چوٹی کرتیں تو بھر بھر ٹکٹے بالوں کے اترا کرتے تھے۔ جب سے انہوں نے سیکا کائی میں بال چھڑ، چھیل چھبیلا اور ناگر موتھا ملا کر سر دھونا شروع کیا تھا واقعی بال چمک دار اور ملائم ہو گئے تھے۔ یا شاید ہمیں اس لئے اب ان کی سب چیزیں اچھی لگتی تھیں کہ وہ ہمیں خدا کی لعنت کے بجائے شریر بچے سمجھنے لگی تھیں۔ پہلے وہ سہاگ کا مان رکھنے کے لئے دوپٹہ کسی بھی اودے پیلے رنگ میں ڈبو کر الگنی پر سکھا لیا کرتی تھیں۔ اب جب سے آگرہ سے چھبیس کی ململ کا تھان منگوایا تھا نہایت صوفیانے رنگوں کے دوپٹے رنگے جاتے۔ بالکل موسم کے حساب سے جوڑے بنا کر لچکا ٹانکا جاتا۔ محرم کے لئے سبز، ساون کے لئے لہرئے دار پیچ رنگے دوپٹے رنگے جاتے۔ ہم بڑی خوشی سے ان کے لئے لوٹوں میں پانی بھر بھر کے لاتے۔ ان کے افشاں لگے دوپٹے دھوپ میں

اُلار اُلار کر سکھواتے اور ڈھیروں اَدھ کھلی کلیاں لا کر ان کے تکیہ پر ڈھیر کر دیتے۔ اُن کی بالیوں میں کلیاں پرو کر گیلے کپڑے میں لپیٹ کر صراحیوں کے پاس رکھ دیتے۔ شام کو وہ نہا دھو کر دھیمے دھیمے رنگ کے کر کرے غرارے اور چکن کی قمیص پر چُنے ہوئے دوپٹے اوڑھتیں، پھول بھری بالیاں پہنتیں اور خلا میں دیکھ کے ایسے مسکراتیں جیسے ان کے بھی کوئی غازی میاں کھڑے ان سے چھیڑ خانی کر رہے ہوں۔

اُن کے بدلے ہوئے رنگ ڈھنگ دیکھ کر گھر کی ذمہ دار خواتین کچھ متفکر رہنے لگی تھیں۔ خالہ کو دورے پڑتے تھے، وہ تو بر حق تھے۔ ہر بدنصیب میاں کی ٹھکرائی عورت کا یہی مشغلہ ہوا کرتا ہے۔ مگر سولہ سنگھار کر کے ہار پھول پہننا اس عورت کو زیب نہیں دیتا جس کا خدائے مجازی اس سے روٹھ چکا ہو۔ اب تو بس اللہ کا شکر کر کے جو پھٹا پرانا ملے تن ڈھانک لیا جائے اور روکھی سوکھی سے پیٹ کی دوزخ بجھالی جائے۔ دنیا دیکھے گی یہ چونچلے، تو کیا کہے گی؟ یقیناً جنم میں تھوکے گی۔

یہ تیل پھلیل، پھول پان، دل میں فاسد خیالات کو بھڑکاتے ہیں۔ شیطان کو شہ ملتی ہے۔

"اے قدسیہ تیرا جی کچھ بھاری ہو تو حکیم صاحب کو بُلوائے لیتی ہوں۔" نانی بیوی ان کی تندرستی سے خائف ہو کر کہتیں۔

"نہیں تو اماں بی۔ اچھی بھلی ہوں!" قدسیہ خالہ چوروں کی طرح نظریں بچاتیں۔

"صبح پڑی اینڈتی رہیں۔ فجر کی نماز قضا کردی!"

"قضا پڑھ لی اماں بی۔"

"وہی تو میں کہوں ہوں یہ رات رات بھر الم غلم نہ جانے کیا بلا بدتر پڑھتی رہتی ہو۔ فجر کی نماز ملے تو کیسے؟"

قدسیہ خالہ آئے دن ناولوں کے وی پی چھڑاتی رہتیں۔ کیا مجال جو کسی کو دکھائیں۔ جیسے ہی کوئی آتا چٹ تکیہ کے نیچے چھپا لیتیں۔

"اوئی یہ چھپکے کیوں پہنے گئے ہیں۔" کبھی قدسیہ خالہ ہاتھ گلے میں کوئی زیور ڈال لیتیں تو نانی بیوی کا منہ ہکس جاتا۔ نہایت فکر مند ہو کر پوچھتیں۔

"ایسے ہی۔ ہمارا جی کرا۔" قدسیہ خالہ کانوں میں چھپکے جھلا کر مسکراتیں۔

"اوئی مواجی نہ ہوا وہ ہو گیا۔" نانی بیوی بڑبڑاتیں۔ "یا تو ہر وقت ماتم کیا کرتی تھیں۔ ڈنڈا سے ہاتھ، بُوچے کان لئے پھرتی۔۔۔ ہائے کن ارمانوں سے بنوائے تھے زیور۔ نگوڑی کو پہننے بھی نہ نصیب ہوئے۔ اے قدسیہ عید بقرید تو کچھ پہن لیا کر۔"

"کس کے لئے پہنوں بی اماں۔" قدسیہ خالہ آہیں بھر کے جواب دیا کرتی تھیں۔ مگر یہ زمانۂ ماضی کی باتیں تھیں، مگر اب۔؟ نہیں جی آثار بالکل اچھے نہیں تھے۔ یہ رات رات بھر واہی تباہی خاک پڑی کتابیں پڑھنا۔ ٹھنڈی آہیں بھر بھر کے صحن کا فرش ناپنا اور آسمان دیکھ دیکھ کر آپ ہی

آپ مسکرانا۔ خاندان پر مر مٹنے والی بیٹیوں کے یہ لچھن نہیں ہوا کرتے۔ یہ سوکھے ہوئے ٹھونٹھ میں کونپلیں کیوں پھوٹ رہی تھیں۔

نانی بیوی نے تو اب قدسیہ کے دولہا کا دل پھیر دینے کی دعائیں مانگنا بھی ناغہ کر دی تھیں۔ دولہا تو خاک بھی نہ آئے۔ ہاں شبیر ماموں پابندی سے آتے۔ ہمیں تو ایسا لگتا تھا وہ دن بدن لمبے سے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ ایسا لگتا جیسے بازی گروں کی طرح پیروں میں بانس باندھ لئے ہیں۔

وہ آکر بہت دور بے تعلق ہو کر بیٹھ جاتے۔ قدسیہ خالہ بھی انجان بنی بار بار دوپٹہ سنبھالتیں، وہ اور بھی مچلتا۔ گریبان کے سونے کے بٹن بوجھل ہو کر دھننے لگتے۔ اب انہیں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لئے آنکھیں استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

پھر وہ ہم میں سے کسی کو اکساتیں۔ "شبیر ماموں سے کہو، "سرکار مدینے والے" سنائیں۔"

ہمیں سرکار مدینے والے سے "آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی" زیادہ پسند تھا۔ مگر خالہ کو خوش کرنے کے لئے شبیر ماموں کے پیچھے پڑ جاتے۔

"ادھر بٹھاؤ مونڈھے پر۔" وہ شہ دیتیں اور ہم انہیں لا کر مونڈھے پر بٹھا دیتے۔ وہ سنانا شروع کرتے تو ہم بور ہو کر جانا چاہتے، مگر خالہ ہمیں پکڑ لیتیں۔ چپکے سے کان میں گاجر کے حلوے اور مونگ کی دال کی

پنڈیوں کی رشوت کا حوالہ دے کر وہ ہمیں مجبور کر دیتیں۔ جیسے ان کے دل میں کوئی چور تھا۔ اکیلی ان کے پاس بیٹھتے ڈرتی تھیں۔ ہم ساتھ ہوتے تو موقع اچھا ملتا تھا۔ دونوں نہ جانے کیا ایک دوسرے سے کہتے۔ اپنے کچھ پلّے نہ پڑتا۔ نہ جانے کس بات پر قدسیہ خالہ ہنسنے لگتیں اور ہنسے جاتیں۔ ہم بھی ساتھ ہنسنے لگتے۔ بچوں کو ہنسنے کے لئے وجہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خالہ کا رنگ نکھر آتا اور پھولوں بھری بالیاں گالوں کو چومتیں۔ سب کو ہنستا دیکھ کر شبیر ماموں کی آنکھوں میں موتی بھر جاتے۔ بے رونق ہونٹ جاگ پڑتے۔

"خماں خاں ہی کو ہنس رہی ہو نگی!" وہ اتنے چپکے سے منہ ہی منہ میں کہتے مگر خالہ سن لیتیں۔

"آپ چاہتے ہیں سدا روتی ہی رہوں۔"

"نہیں قدسیہ! میں...... میں تو چاہتا ہوں......" وہ ہکلانے لگتے۔

"کِسے چاہتے ہیں؟" قدسیہ خالہ ان کی بات بیچ سے لپک لیتیں اور اپنے مطلب کی بنا لیتیں۔

"قدسیہ......" بڑبڑ ماموں نہ جانے کیا کہتے۔ خاک سمجھ میں نہ آتا۔ ہم احمقوں کی طرح منہ تکتے۔

"بڑبڑ۔۔۔" قدسیہ خالہ نہ جانے کیا کہتیں اپنی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر اتنا اندازہ ہو جاتا کہ نہایت میٹھی اور پیاری پیاری باتیں ہو رہی ہوں گی۔ اُن کے چہروں کے تاثر سے ہمارے دلوں میں بھی لڈو پھوٹنے

لگتے۔ بچے بہت سی ان کہی باتوں کا مطلب سمجھ لیتے ہیں، محسوس کر لیتے ہیں۔ ہم کھلکھلا کر ہنستے، انہیں آڑ مل جاتی۔

''جھوٹے! کھایئے میری جان کی قسم!''

''کوئی اپنی جان کی قسم کیسے کھائے!'' وہ اتنے ہولے سے کہتے کہ بہری بھنڈ نانی بیوی خاک نہ سن پاتیں۔ دادی اماں کا مورچہ ذرا پرے کو تھا۔ فریقین میں آج کل زور کی چل رہی تھی۔ دادی اماں نے مجلس کی مٹھائی بھجوائی۔

''نگوڑی قلتین ہو گئی۔'' نانی بیوی کہتی تھیں۔ ''شیعہ تھوک اور غلاظت ملا دیتے ہیں۔'' اُنہوں نے سب کے سامنے نکتیوں کے لڈّو بطخوں کو چگا دیئے۔ دادی اماں خون کے سے گھونٹ پی کے رہ گئیں۔ مگر جب نانی بیوی نے سہارنپور سے آئی ہوئی پارسل میں سے انہیں لوکاٹ بھجوائے تو انہوں نے فوراً مہترانی کو دے دیئے۔

''اری بہو دھولیجیو۔'' انہوں نے نانی بیوی کو جلانے کے لئے باآواز بلند مہترانی کو رائے دی۔

پھر نہ جانے قدسیہ خالہ کیا بسورتیں، فضا مکدر ہو جاتی۔ خالہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے پر مصر ہوتیں۔ شبیر ماموں مجرموں کی طرح فرش کی اینٹوں کو اس انہماک سے گھورتے جیسے ذرا نظر چوکی تو وہ اُچھل کر بھاگنے لگیں گی۔

شام ہو جاتی۔ شبیر ماموں اٹھ کر چلے بھی جاتے، مگر خالہ کی

آنکھوں میں روشن شمعیں جگمگاتی رہتیں۔ ہونٹ مسکراتے رہتے۔ جیسے کبھی بُوا بالے میاں کو دیکھ کر آپ ہی آپ بڑے نازو انداز سے مسکرایا کرتی تھیں۔ جب اُن کی بالے میاں سے ان بن نہیں ہوئی تھی۔ مگر اب تو بُوا کی آنکھیں خالی ہو چکی تھیں، جیسے بنا تیل کے بتیاں دھواں دے رہی ہوں۔ عجب باسی پن چھایا رہتا۔ علاج ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا مگر معلوم ہوتا تھا حکیم صاحب قبلہ کی گولیاں اُن کے معدہ میں چپک گئی تھیں۔ آئے دن پیٹ خراب رہتا، کھٹی ڈکاریں آیا کرتیں۔ بُوا جو کبھی چڑیا کی زبان اور روٹی کا پھپولا کھایا کرتی تھیں اب بھر بھر رکابی مکئی کا بھات اور ارہر کی دال کھاتیں۔ اور دن بھر کھٹی ڈکاریں لیا کرتیں۔ نیند کا جیسے مرض ہو گیا تھا۔ جب دیکھو جب منہ کھلا ہے، کسی چیز کا سہارا لئے چپ چپ سو رہی ہیں۔ جب پاگل تھیں تو نیند نہیں آتی تھی، اب تو مزے سے ہر وقت اونگھتی تھیں۔ ہوشیار بھی خاصی ہو گئی تھیں۔ روز کرایہ داروں سے جا کے دنگا کرتیں۔

”حرامجادے کراوانا ہیں دیت ہیں! ہر کوئی ہم کا لُوٹنے کی پھکر میں رہت ہے۔“ بُوا نے ہوش آتے ہی دیکھا، دنیا لٹیروں اور چوروں سے بھری پڑی ہے۔ جیسے ان کی آنکھوں میں کسی نے جادو کی سلائی پھیر دی ہو۔ چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مکان چو رہا ہے۔ مگر مرمت کس سے کرادیں، راج مزدور چور ہوتے ہیں۔ مونڈ کے رکھ دیں گے۔ کڑوں کے بعد شیر کے منہ والی ہنسلی بھی گڑھوالی اور فوراً اماں کے پاس لا کر لوہے کے سیف میں رکھوا دی۔ پھر بھی اطمینان نہ ہوتا تھا۔ ہر وقت کڑے ہنسلی کی خیریت

پوچھتیں۔

"بھائی تالی تو ٹھیک سے رکھی ہے؟"

کہیں آس پاس چوری ہو جاتی تو بوا پر قیامت ٹوٹ پڑتی۔ فوراً اماں سے سیف کھلوا کر اطمینان کرتیں۔ ہمیں اب وہ اپنی پیاری بوا نہیں دوسری بے وقوف عورتوں کی طرح لگتی تھیں۔ پرانے تعلقات بالکل ذہن سے اتر گئے تھے۔ اب انہیں مسالہ پیستے، چولھا جھونکتے دیکھ کے چڑ سی آتی۔ اب تو ہم اُن کے ساتھ سونے کی ضد بھی حماقت سمجھتے تھے۔ ان میں تازہ کھدی مٹی کی سوندھی مہک کے بجائے لہسن پیاز اور باسی کھانوں کی سڑاند آتی تھی۔

قدسیہ خالہ اور کھل گئیں۔ نانی بیوی سر گئیں پیر آئیں مگر انہوں نے دوانہ پی اور کھلے بندوں شبیر ماموں سے میر کا کلام پڑھنے میں مدد لینے لگیں۔ شام ہوتی، عصر کی نماز کے بعد جیسے ہی قدسیہ خالہ بائیں طرف سلام پھیرتیں طلسمی دیو کی طرح شبیر ماموں صدر دروازہ پر نمودار ہو جاتے۔ وہ سمجھاتے اور خالہ سمجھتیں۔ دونوں کی آنکھیں جھکی رہتیں۔ چہرے اجنبی بنے رہتے۔ کبھی لمحہ بھر کو آنکھیں جڑ جاتیں تو ہمارے دلوں میں بے سمجھے بوجھے ہل چل سی مچ جاتی جیسے آسمان پر رنگ برنگی پتنگوں میں پیچ پڑ گئے ہوں۔

جب ہم بچے سمجھنے لگے تو نانی بیوی تو ایک خرانٹ تھیں۔ اُدھر سے دادی اماں کی معنی خیز ناقدانہ مسکراہٹیں۔

"اے بی کچھ ایسی ویسی ہو جائے تو ناک صاحبِ خانہ کی کٹتی ہے۔"
وہ بدبودار پٹھانی سے پیر دبواتے وقت اسے باریک باریک فلسفے کے نکات سمجھایا کرتی تھیں۔ بالکل جیسے عام سیاست پر تنقید ہو رہی ہے۔ "کسی کی طرف اشارہ ہو تو خدا کی پھٹکار۔ ویسے اگر کہیں پانی مرتا ہو تو وہ کیا کریں!"

نانی بیوی سنتیں اور پھڑ پھڑاتیں۔

"اللہ ذری املی توڑ دیجئے، چٹنی پسوائیں گے؟" قدسیہ خالہ گریبان کے بٹنوں سے کھیل رہی تھیں۔ شبیر ماموں آکر بیٹھے ہی تھے۔

"کاہے سے توڑوں؟۔۔۔ کوئی بانس وانس!"

"اوئی! ماشاء اللہ آپ کیا کسی بانس سے کم ہیں۔ ذری ہاتھ بڑھا کے توڑ لیجئے۔"

ایک پل کے لئے شبیر ماموں کی آنکھوں میں کوندا سا لپکا۔ ایسا لگا وہ زندہ ہیں اور اگر آس پاس کوئی نہ ہوتا تو یقیناً وہی حرکت کیا کرتے جو منجھو بی کا منگیتر اسے اکیلے دو کیلے بھیج کے کیا کرتا تھا۔

کالے دیو نے قدسیہ خالہ کی گردن کاٹ کے سرہانے کی چھڑی پائنتی اور پائنتی کی سرہانے رکھ دی تھی۔ ان کی گردن سے لعل ٹپک ٹپک کر شبیر ماموں کی جھولی میں گر رہے تھے مگر وہ بے بس تھے کیونکہ دیو نے جادو کی چھڑی گھما کر انہیں مکھی بنا دیا تھا۔ اگر ان میں اتنی سکت ہوتی اور وہ آگے بڑھ کے پائنتی کی چھڑی سرہانے رکھ دیتے تو قدسیہ خالہ کا کٹا ہوا سر فوراً جڑ جاتا۔

شبیر ماموں کے جانے کے بعد نانی بیوی نے قدسیہ کو ان کی شوخی پر پھٹکارا۔

"تو کیا میں نے کوئی چھنالا کر لیا۔" وہ ایک دم پھُنکار کے اٹھ بیٹھی۔

"ہے، ہے نامراد لوگ کیا کہیں گے۔ مانا کہ شبیر بڑا شریف بچہ ہے۔ غیر نہیں رشتہ میں دیور ہوتا ہے، مگر یہ دنیا بڑی تھڑدِلی ہے۔ بات کا بتنگڑ بنتے دیر نہیں لگتی میری بانو۔"

"جوتی پہ واروں اس دنیا کو۔ دس برس سے جوانامرگ مجھے رلا رہا ہے۔ اسے دنیا کچھ نہیں کہتی۔" سچ ہے لڑکیوں کو اُلٹی سُلٹی کتابیں نہیں پڑھانی چاہئیں۔ زمانہ بھر کا بس بھرا ہوتا ہے۔

"بیٹی وہ مرد ذات ہے۔ اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ عورت کی عزت نازک آئینہ ہوتی ہے۔ ایک دفعہ بال پڑ گیا تو ساری عمر کو منہ ٹیڑھا ہی دکھائی دے گا۔"

"اُونھ!" قدسیہ خالہ لاجواب ہو کر اپنی قمیص سے میچ کرتی چوڑیاں ڈبے میں سے چھانٹ کر پہننے لگیں۔

"میرے تو گردھر گوپال...... دوسرا نہ کوئی......" وہ گنگنانے لگیں۔

"اب تو بیل پھیل گئی، کیا کرے گا کوئی۔"

"میرے تو......"

"اے بیٹی تم سے کتنی دفعہ کہا کہ یہ مُوئے کافرانہ گیت نہ الاپا کرو۔ گناہ ہوتا ہے۔ ظہر کی نماز بھی کھا گئیں۔ کتنا کتنا جگایا مگر پڑی اینڈتی رہیں۔ رَت جگے ہوں گے تو دن کو چمگادڑوں کی طرح پڑ کے سوؤ گی۔"

وہ تنک کر اٹھیں کہ دوپٹہ زمین پر لوٹ گیا اور گریبان کے بٹنوں کے گھنگھرو بج اُٹھے۔ لوٹا لے کر چوکی پر وضو کو بیٹھ گئیں۔

نانی بیوی کیا سب ہی بھلی بیویوں کو تن تن کے چلنے والی لڑکیوں سے چڑ تھی۔ شریف بچیاں رَسان رَسان ادب سے چلتی ہیں۔ قدسیہ خالہ کی نئی نئی پھُرتی دیکھ کر نانی بیوی کو جھٹکے سے لگتے تھے۔

"اے بی یہ کیا چال ہے جیسے لقا کبوتری۔ اگایا پچھایا باہر کو نکلا پڑتا ہے۔"

"قدسیہ خالہ کے منہ لگنا اپنی جوتی اپنے سر مارنا ہے۔" انہوں نے اماں سے مسکوٹ کی۔

"یہ شبیر مُوا جان کے پیچھے اچھا لگا ہے۔ کتنی دفعہ منگھم میں ٹوک چکی ہوں۔ مگر جانو وہ بھی قدسیہ کی شہ پا کے ڈھٹائی پر تل گیا ہے۔ مجھے تو خلجان ہوا جاتا ہے۔"

"اے بی تمہیں تو خبط ہو گیا ہے۔ اور کچھ نہیں تو شبیر نگوڑے پر شک آنے لگے۔ دو گھڑی دُکھیا ہنس بول لیتی ہے۔ جینے کا کوئی تو بہانہ چاہئے۔" اماں اچھے موڈ میں ہوتیں تو نانی بیوی ٹوٹنے لگتیں۔

"اے خاک پڑے ایسے جینے پر۔ کیا ارادے ہیں؟ تم بھی بہن کے ٹسوے دیکھ کے پھسلی جاؤ ہو۔"

"میں کہوں اگر ایسا ہو جائے تو کیا برائی ہے؟" اماں نے ٹھٹکتے ہوئے کہا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا؟"

"مچھو کہہ رہے تھے انہوں نے ایک اپنے دوست وکیل سے مشورہ کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں......" چچا میاں کا نام مستقیم تھا مگر پیار میں مچھو کہلاتے تھے۔ مستقیم کے معنی ہیں سیدھا، مگر چچا میاں کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ انتہا سے زیادہ اینگے بینگے تھے۔

"آگ لگے خدائی خوار کے منہ میں۔ رنڈیوں کے ٹکڑوں پہ پلنے والا مُوا بھڑوا۔" نانی بیوی نے چچا میاں کی قبر کھود ڈالی۔ جو نہایت زندہ مونڈھے پہ بیٹھے قدسیہ خالہ سے سر میں تیل لگوا رہے تھے۔

"اے ہے میں کہوں......" اماں ہکلائیں۔

"خبردار جو تم نے اس معاملہ میں زبان کھولی۔ کیا بہنا کو دوسرا خصم کراؤ گی؟"

"اے غارت ہو۔" ہمیں غور سے اس قدر راز کی باتیں سنتے پا کر

اماں نے ایک دھموکا جڑا۔

قدسیہ خالہ ان باتوں سے بے خبر چچا میاں کے کچھ پوچھنے پر شرما رہی تھیں۔ ان کے سفید گال تمتما کر گلابی دوپٹے میں ڈوبے جارہے تھے کہ ٹاٹ کا پردہ سرکا اور شبیر ماموں غوطہ مار کے اندر آئے۔ وہ ہر دروازہ سے اپنا سر بچانے کے لئے سر نیہوڑا لیا کرتے تھے۔ فضا ایک دم سانس روک کے تھم گئی۔ اماں نے اپنا بڑے پائنچوں کا پاجامہ تہہ کر کے کمر میں اڑسا اور رام جھول چھنکاتی چلیں۔ ابا کی ٹم ٹم کی گھنٹی کی آواز دور ہی سے آجاتی تھی۔ وہ کلب سے لوٹ کر باہری زینہ سے اوپر چلے جاتے۔ بالکل میر قافلہ کی طرح وہ سب سے الگ تھلگ سکون سے اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ اماں چھن چھن کرتی اپنا پنڈ چھڑا کے پتی سیوا کرنے چلی گئیں اور نانی بی نے مورچہ سنبھالا۔ چچا میاں بھی عموماً ٹم ٹم کی گھنٹی سن کے سرک لیا کرتے تھے۔ گمبھیر طبیعت والے بڑے بھائی سے ان کی روح فنا ہوتی تھی۔ حتی الامکان کنی کاٹ جاتے کہ کہیں کسی بات کی پوچھ گچھ کے لئے طلبی نہ ہو جائے۔ باتیں وہ ایسی کرتے تھے کہ پوچھ گچھ کے جھمیلے میں نہ پڑنے ہی میں خیر و عافیت تھی۔

شبیر ماموں نے کتابوں کا بنڈل پلنگ پر رکھتے رکھتے کچھ منہ ہی منہ میں کہا۔ قدسیہ خالہ نے پھُس سے کچھ جواب دیا اور وہ دادی اماں کو سلام کرنے اُن کے برآمدے میں چلے گئے۔

نانی بیوی ان کی تاک میں ایسے بیٹھی تھیں جیسے چوہے کے لئے

بلّی۔ جیسے ہی وہ بر آمدے میں غوطہ مار کے نکلے انہوں نے دبوچ لیا۔

قدسیہ خالہ کچھ جھینپی سی ابا کے لئے کھانا اتروانے باورچی خانہ کی طرف چلی گئیں۔ کھانے کے خوان چُنے جارہے تھے۔ وہ یہ سوچ کے کہ اماں بی کوئی خوشگوار راز کی باتیں شبیر سے کر رہی ہوں گی آپ ہی آپ گنگنا رہی تھیں۔ ڈھول مڑھ کر آگیا تھا۔ وہ چوکی پر بیٹھ کے کڑیاں چڑھانے لگیں۔ بُوا اکتائی سی دیوار سے لگی بیٹھی ایک طرف کو تھوک رہی تھیں۔ شاید املتاس کے مزے کو تھوکنا چاہتی تھیں۔ ہر وقت جہاں بیٹھتیں تھوکے جاتیں۔

"اچھی بُوا ذری وہ نوٹنکی والے کی گنکری بتاؤنا۔ نگوڑا کیسے تھاپ مارتا تھا۔"

بُوا نے ایک دفعہ ڈھول کو ایسے دیکھا جیسے پوچھتی ہوں "یہ کیا بلا ہے؟" پھر منہ پھیر کر تھوک دیا۔

"ہائے بُوا تمہیں بالے میاں کی قسم!" انہوں نے ڈھول سرکا کر بُوا کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا پھر ایک دم چھوڑ دیا۔

"ہائے بُوا تمہیں تو بخار ہے۔" ان کا ماتھا چھوا تو جل رہا تھا۔

کئی دن سے نانی بیوی چلا رہی تھیں کہ بُوا نے میرا بر آمدہ گمکا کے رکھ دیا ہے۔ ناک نہیں دی جاتی۔ اے بھئی ان سے کہو اپنے گھر جا کے رہویں۔ کرائے دار تو بھاگ گیا۔ دونوں وقت کھانا یہاں سے پہنچا دیا جائے گا۔" انہوں نے اماں کو چڑھایا۔ ان کی دلچسپی بھی اب بُوا میں ختم ہو چکی

تھی۔ جو کچھ ہو سکتا تھا سب نے ان کی بھلائی کے لئے کیا۔ ابا پنشن کی فکر میں کفایت شعاری پر ہر وقت زور دیتے۔ اس مہمان نوازی نے تو پست کر ڈالا تھا۔ ہر موسم، ہر تہوار، ہر بہانے سے مہمان آن دھمکتے۔ پُر تکلف کھانے پکتے۔ موسم اور تہوار کے اعتبار سے جڑاول یا گرمی کے کپڑے بنوائے جاتے۔ مہمان بد ہضمی سے بال بال بچ کر تحفے سمیٹ کر رخصت ہوتے تا کہ نئے مہمانوں کے لے چارپائیاں خالی کر سکیں۔

بُوا کا مستقبل کافی سنوار دیا گیا تھا۔ جی اچھا نہیں رہتا تھا تو اس میں کسی کا کیا قصور۔ الا بلا زہر مار کر لیتی تھیں۔ اُن کی چمارن سے عرصہ ہوا پیچھا چھوٹ چکا تھا۔ وہ ایک دن آئی بھی، دیر تک بیٹھی ان کے پیر دباتی رہی۔ اُن کی دُرگت پر آنسو بہاتی رہی مگر پھر ڈانٹ کے بھگا دی گئی اور پیپل کے پیڑ کے نیچے رہنے لگی تھی۔ بھیک سے گزر ہو جاتی ہو گی۔

مگر اب مجبوری تھی۔ عُرس کے موقع پر منجھو مع اپنے سسرال والوں کے آ رہی تھی۔ اُس کی ساس بہو کی گود ہری ہونے کے لئے منت ماننے آنا چاہتی تھیں۔ اس لئے بُوا عارضی طور پر اپنے گھر چلی گئیں۔ اُن کی لاڈلی چمارن پھر برآمدے میں آ کے ڈٹ گئی۔ تین وقت چائے اور کھانا سینی میں لگ کر چلا جاتا۔ جی اچھا ہوتا تو وہ خود آ جاتیں۔ کبھی کئی کئی دن پڑی رہتیں۔ نانی بیوی کے برآمدے میں جب سے قلعی ہوئی تھی وہ بہت محتاط ہو گئی تھیں۔ اتنی صاف جگہ اب بُوا کو اُٹھتے بیٹھے بھی ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔ پہلے آیا کرتی تھیں تو گھر کی بیوی سے زیادہ اُجلے کپڑے ہوتے تھے تو ساتھ

بیٹھتی تھیں۔ پھر میلی ہونے لگیں تو ان کے آتے ہی سامنے پیڑھی یا پیڑھا سرکادیا جاتا اور وہ بیٹھ جاتیں۔ پیڑھی نہ ہوتی تو دہلیز پر بیٹھتیں۔ مہترانی، دھوبن اور دوسری نیچ عورتوں کی طرح۔ دادی اماں کسی کا جھول نہیں پالتی تھیں۔ ان کے پاس جاؤ تو جی گھبرانے لگتا تھا۔ ہر وقت ''ہوں ہوں'' کا نکھتی رہتی تھیں۔ کبھی رات کو جانے کی سکت نہ ہوتی تو بھینس کے چھپّر میں آدھی کھٹیا اندر آدھی باہر ڈال کے پڑ رہتیں۔ گوبر اور مرغیوں کی بیٹ کی بدبو میں بُوا کی بدبو دب جاتی تھی۔

شبیر ماموں جو اس دن نانی بیوی سے بات کر کے گئے تو جیسے غائب ہی ہو گئے۔ قدسیہ خالہ بورانی ہو کر ٹہلتیں۔ سونے کی تو انہوں نے قسم ہی کھالی۔ جب دیکھو کروٹیں بدل رہی ہیں۔ مارے فکر کے نانی بیوی گھلی جاتی تھیں۔

سنجھلی کا پھر نصیبہ جاگنے والا ہو رہا تھا۔ اُس کی ہونے والی خلیا ساس اور دیورانی بارہ بنکی سے آئی ہوئی تھیں اور خاطریں وصول کر رہی تھیں۔

''اے انہی کے میاں نے میم ڈال لی ہے!'' ہونے والی دیورانی

نے بڑے تاسف سے پوچھا۔ قدسیہ خالہ عمر میں پہلی بار بجائے فخریہ نڈھال ہونے کے نہایت بھونڈے پن سے ہنسیں۔

"ہاں بہن۔ میم ہے ہماری سوتن! پر سنا ہے تمہارے میاں نے تو تیلن ڈال لی ہے؟"

بات درست تھی مگر بلی کے گو کی طرح چھپائی جاتی تھی۔ دیورانی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہ چلی گئیں تو پتہ چلا لڑکا ذرا کانا ہے۔ مگر سب کو یقین تھا کہ یہ والی اڑچن سنجھو کی شادی میں قدسیہ نے ڈالی۔ حکیم صاحب قبلہ سے قدسیہ خالہ کی صحت کے بارے میں رجوع کیا گیا تو انہوں نے وہی سوداوی مادّے کی افراط تشخیص کی اور وہی نامراد املتاس والا نسخہ،۔۔۔خون کی حدت کا واحد علاج!

نانی بیوی نے قدسیہ خالہ کی ایک نہ سنی اور اپنے برآمدے میں اینٹوں کا چولہا جما کے اپنے ہاتھ سے تریاق تیار کیا۔

"بیٹی اللہ شافی اللہ کافی کہہ کے پی جاؤ۔" نانی بیوی نے انھیں بادیہ تھما کر پیٹھ سہلائی۔

قدسیہ خالہ نے بڑے اطمینان سے بادیہ موری میں ٹھیک اس جگہ پھینکا جہاں ایک دن بوا نے پھینکا تھا۔

"اللہ کی مار ہو تجھ پہ...... یہ کیا کر رہی ہے۔" نانی بیوی چلائیں مگر خالہ بڑے اطمینان سے ڈھول اتار کر اس پر وہ بول نکالنے لگیں جو حال ہی میں مہترانی سے سیکھے تھے۔

نانی بیوی نے جل کے ڈھول چھینا تو وہ زور سے جھٹکا ان کا ہاتھ کہ بڑی بی گرتے گرتے بچیں۔

"تمہارے اوپر بوجھ بن گئی ہوں تو مجھے زندہ دفن کرادو، کتّے کی موت کیوں مارنا چاہتی ہو۔ میں یہ زہر نہیں پیوں گی، ہر گز نہیں پیوں گی۔" آج ہی انہیں پتہ چلا تھا کہ اس دن شبیر میاں کو نانی بیوی نے بڑے سلیقے سے آنے کو منع کیا تھا۔

"تم تو اسے بہن سمجھتے ہو میاں، مگر دنیا بڑی ظالم ہے۔" انہوں نے سمجھایا تھا اور شبیر میاں سمجھ گئے تھے۔

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے مُردار!"

"ہاں دماغ خراب نہ ہو گا تو اور کیا ہو گا۔ انسان ہوں پتھر نہیں۔ پندرہ برس کی عمر میں مجھے بھاڑ میں جھونک دیا۔ سُہاگ کی مہندی بھی پھیکی نہ پڑی تھی کہ سات سمندر پار چلا گیا۔ وہاں اُسے سفید ناگن ڈس گئی۔ پر یہ تو بتاؤ میں نے کیا قصور کیا تھا۔ کسی سے دیدے لڑائے تھے، کسی سے یاری کی تھی؟"

"تیرے پھوٹے نصیب بیٹی۔ خدا کی مرضی میں کس کو دخل ہے۔"

"میں نے خدا کے حضور میں کون سی گستاخی کی تھی کہ مجھے یہ سزا ملی۔ اور وہ کمینہ عیش کر رہا ہے۔"

"بدنصیب، شوہر کو کمینہ کہتے شرم نہیں آتی...... وہ تیرا خدائے

مجازی ہے۔"

"لعنت ہو اُس کی صورت پہ۔ لچا زمانے بھر کا۔" قدسیہ خالہ اور

بڑھیں۔

"اری کمبخت! تجھے اپنے سہاگ کا بھی مان نہیں۔ اُس نے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ شرع میں چار نکاحوں کا حکم ہے۔ تم ہی ایک نرالی نہیں ہو بنو۔ ہزاروں پر پڑتی ہے۔ مگر شرافت سے جھیلتی ہیں۔ مرد کی ذات ہی بے وفا ہوتی ہے۔"

لاجواب ہو کر قدسیہ خالہ خود کو کوسنے لگتیں۔ "یا اللہ! مجھے اٹھا لے، اے پاک پروردگار میری مٹی عزیز کر لے کہ اس عذاب سے تو جان چھوٹے۔ یا اُس مُردود کو موت دے کہ میرا دم ہی چھوٹے اُس نابکار سے۔"

"اری چڑیل یہ تو کسے کوس رہی ہے!" نانی بیوی کانپ اٹھیں۔

شوہر پھر شوہر ہوتا ہے۔

"باقر حسین تمہارے چہیتے داماد کو۔ حرامزادے کتیا کے جنے کو۔" قدسیہ خالہ گئیں ہاتھ سے۔۔۔ "اسے دوزخ کی آگ جلائے۔ قبر میں کیڑے بج بجائیں۔" وہ دوپٹہ پھیلا کر جھوم جھوم کر کوسنے لگیں۔

"تو کیا دوسرا خصم کرے گی؟"

"ہاں کروں گی...... کروں گی......" نہیں یہ قدسیہ خالہ نہیں تھیں۔ کوئی بھتنی تھی۔

"تو جا کوٹھے پر کیوں نہیں بیٹھ جاتی؟"

"کوٹھے پر بھی بیٹھ جاؤں گی۔ دیکھتی ہوں کوئی میرا کیا کر لیتا ہے۔" قدسیہ خالہ قطعی کوٹھے پر بیٹھنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھیں۔ غصہ میں بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ نانی بی خوب نانا میاں کو یاد کر کے روئیں۔ جس دن سے شبیر ماموں نے آنا بند کیا تھا ماں بیٹی میں یہ تو تو میں میں روز ہوا کرتی۔ قدسیہ خالہ کی سسرال تک بات پہنچ گئی۔ اُن کے سسر بہت کبیدہ خاطر ہوئے۔

"اماں نے لاڈ میں دماغ خراب کیا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو بہو بیگم خاندان کی ناک کٹوائیں گی۔ بہتر ہے انہیں یہاں بلا لیا جائے۔ عقل درست ہو جائے گی۔" نانی بیوی بھی بھیجنے کو تیار ہو گئیں۔ اب وہ اُن کے قابو کی نہ تھیں۔

"ہاں بھئی وہ جانیں اور اُن کی بہو۔ میں کہاں تک مغز ماری کروں۔" نانی بیوی نے فیصلہ کیا۔ مگر سسرال کے بلاوے کا ذکر سن کے قدسیہ خالہ بالکل بکھر گئیں۔

"بیٹے کو کچھ نہیں کہتا مکّار کہیں کا۔ آگ لگے اس کی ڈاڑھی میں۔ جھل لگے اُس کی صورت کو۔"

"ارے بدبخت، تیرا ماموں ہے!" نانی بیوی چلائیں۔

"تھو ہے ایسے ماموں کے جنم میں۔ چھوٹے منہ سے اپنے بیٹے سے نہ کہا گیا کچھ؟ ارے وہ تو بڑے خوش ہیں۔ میم آتی ہے تو للو چپّو کرتے ہیں۔ چھری کانٹے سے میز کرسی پر ڈنر کھاتے ہیں۔ بیٹے کے ٹکڑوں پر پلتے

ہیں نا۔ اس لئے میم کے سامنے کتے کی طرح دم ہلاتے ہیں۔ بس وہ میم ہی تو انہیں بخشوائے گی!۔ اسی کا سایہ پکڑ کے جنت ملے گی!"

"بکے جائے گی مُردی؟ اے خدا اِس ناہنجار کا پردہ ڈھک لے! آگ لگے تیری زبان کو۔" انہوں نے جوتی سنبھال کے قدسیہ خالہ کے ہونٹ کچل دیئے۔

پھر تو بس اُن پر جیسے مرگھٹ کی بھتنی سوار ہو گئی۔ دانت کچکچا کر انہوں نے نانی بیوی کی دونوں سینک سلائی جیسی کلائیاں مروڑ کے رکھ دیں۔ ایک پل کو نانی بیوی نے ان کی بپھری ہوئی آنکھوں میں دیکھا اور ان کا کلیجہ سن سے رہ گیا۔ وہاں ان کی عزیز از جان بیٹی قدسیہ بانو نہیں تھیں۔ چوٹ کھائی شیرنی تھی کہ پھن کچلی ناگن! جس کی آہنی گرفت میں اُن کی جان کھنچنے لگی۔ لرز کے بڑی بی دُہری ہو گئیں۔

"ہائیں ہائیں" کہہ کے سب دوڑ پڑے۔ شکاری کتوں میں گھری ہوئی ہرنی کی طرح وہ سر پیر سے لرزنے لگیں۔ "ہائے یہ کیا کیا قدسیہ بندی تو نے؟ اماں بی کے اوپر تیرا ہاتھ اٹھا؟" ہر طرح بے بس ہو کر انہوں نے دونوں ہاتھ چبوتری پر پڑی ہوئی سِل پر دے مارے۔ چوڑیاں چکنا چور ہو گئیں۔

"اے ہے لوگو کیا ہو رہا ہے۔" بہری دادی اماں کا دم گھٹ رہا تھا۔

"اے لڑکیو! ذرا چراغ کی لو تو اُکساؤ...... کیا ہو رہا ہے؟" لالٹینیں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔ مگر دادی اماں کا اندھیرا کون دور کر سکتا تھا۔ اندر باہر کھلبلی

پڑ گئی۔ سارے نوکر ٹھٹ لگا کے صدر دروازے کے پاس جمع ہو گئے۔ چاروں طرف سے بیویاں پائنچے سنبھالتی دوڑیں۔ بچے بسورنے لگے، مرغیاں کڑکڑانے لگیں۔

"خبردار جو کسی نے مجھے ہاتھ بھی لگایا۔ قرآن پاک کی قسم سر پھاڑ دوں گی!" قدسیہ خالہ نے سل کا بٹہ سر سے اونچا اٹھایا۔ سب کو اپنی جان پیاری تھی۔ سب ہائے توبہ مچاتی رہیں۔ آگے بڑھنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ قدسیہ خالہ نے بٹہ پٹخ کر پیا بے پیا شیشہ بٹورنا شروع کیا۔ اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھ ہونٹوں تک پہنچتے، شبیر ماموں نے بڑے اطمینان سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

دس برس بعد کسی مرد نے انہیں ہاتھ لگایا!۔۔۔ ان کے ہاتھ بے بس ہو کر نیچے گر گئے۔ مڑ کر انہوں نے شبیر حسن کی آنکھوں میں دیکھا!۔۔۔ اس وقت تو وہ بہشت بریں سے بھی لوٹ آتیں۔ آنکھیں موند کر وہ تیورا کر اُن کے سینہ پر گریں۔

ایک لمحہ کو شبیر حسن کے ناکارہ ہاتھ ٹھٹکے۔ پھر انہوں نے سب کے سامنے خالہ کو اتنی زور سے کلیجہ سے بھینچا کہ اُن کی پسلیاں کڑکڑا گئیں۔ سارے کنبہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ہم لوگ اِکڑی ڈکڑی چھوڑ منہ پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ ایک دَم فضا نے دم سادھ لیا۔ نانی بیوی ٹوٹے چھپر کی طرح ڈھے گئیں۔

"کیا ہو رہا ہے لوگو!...... یہ چپکا کیوں پڑ گیا......؟" دادی اماں سجدہ

گاؤ تکیہ کے نیچے سے نکالنے لگیں۔ "کیا سب نے نیت باندھ لی کہ کوئی نہیں بولتا؟"

شبیر حسن نے ان کا نحیف و زار جسم دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔ ایسا لگا اب وہ کبھی ان ہاتھوں سے انہیں دور نہ ہونے دیں گے۔ اسی طرح انہیں اٹھائے چلے جائیں گے۔ کسی میں زور سے سانس لینے کی ہمت بھی نہ تھی۔ انہوں نے دل پر پتھر رکھ کے ہولے سے قدسیہ خالہ کو پلنگ پر ڈال دیا اور بے تعلق دور کھڑے ہو کر فرش گھورنے لگے، جیسے کہتے ہوں۔ "لو بھئی یہ پڑی ہیں قدسیہ بانو، اس وقت بے ہوش ہیں اچھا موقع ہے چپکے سے کوئی آؤ اور گلا گھونٹ دو، رنجھار نجھا کے نہ مارو۔"

حکیم صاحب قبلہ نے فوراً نبض دیکھ کر کہہ دیا کہ سر کو گرمی چڑھ گئی ہے۔ صاحبزادی کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ اللہ پاک کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں۔

"بکت ہیں بید جی۔" بدبودار پٹھانی نے لہنگا جھاڑتے ہوئے فیصلہ کیا۔ "ہم کا تو کچھ اور ہی دکھائی پڑت ہے۔"

"ہاں بھئی مجھے بھی ایسا لگے ہے جیسے مُوا انگوڑی کا جن اُنہیں چھوڑ

کے نچی پر پیش ہو گیا ہے۔ دیکھتی نہیں بہن جوں جوں یُو اسد ھرتی گئیں قدسیہ بانو کے طور بگڑنے لگے۔" باقری پھُپو نے نانی بیوی کو یقین دلایا۔ "غضب خدا کا چٹے کپڑے پہن کے لاڈو عطر پھلیل لگا کے وقت بے وقت چمن میں ٹہل لگایا کرتی ہیں۔"

ایک دم قدسیہ خالہ کی پوزیشن اونچی ہونے لگی۔ اب وہ اکیلی نہیں تھیں۔ جن بھوت پریت یا کوئی پیر مرد بھی ان کے ساتھ تھے۔ ہماری اماں بے چاری فوراً ان سے نہایت مرعوب ہو گئیں۔ اماں تو بس اللہ میاں کی گائے تھیں، ہر عقل میں نہ آنے والی چیز سے احتیاطاً ڈرتی رہتی تھیں۔ پیر مرید، بھوت پریت اور جن، وہ کوئی بھی ہو، وہ کسی سے الجھنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ تو اس لئے ست نرائن کے لئے بھی چندہ دے دیتیں۔ پانچ ٹانگ کی گائے کو گھاس کھلواتیں، سانپوں کو دودھ پلواتیں۔

"بیٹی یہ کفر ہے۔" نانی بیوی سمجھاتیں۔ "نذر نیاز کی اور بات ہے مگر یہ موئی کتھا میں اپنی عاقبت نہ بگاڑو۔"

مگر اماں کو عاقبت سے زیادہ اپنا سہاگ اور بچے پیارے تھے۔ ارے بھئی کیا پتہ یہ دیوی دیوتا بگڑ کھڑے ہوں تو ان کا کوئی کیا بگاڑ لے گا۔ قبرستان سے لگا ہوا شمشان بھومی تھا۔ بچے بے نتھے بیلوں کی طرح ہر طرف دندناتے پھرتے۔ ایک دفعہ کسی مندر میں کچھ بھگوان کا اپمان کر آئے۔ مہنت جی دہائی دیتے ہوئے آئے۔ اماں نے فوراً پرائشچت کے لئے بامن کھِلوائے کہ دیوتا غصہ میں تختہ نہ لوٹ دیں۔ مندر سے پرساد آتا تو

سب بیویاں تھو تھو کر کے کہتیں "مرغیوں کو ڈالو نجس ہے۔" مگر اماں طاق میں رکھ دیتیں۔ بچے فوراً ٹھکانے لگا دیتے تب انہیں اطمینان ہوتا۔ بچے تو پتھر بھی کھالیں تو ڈکار نہ لیں اور بھئی کسی کو کیا پتہ شاید پرساد میں برکت ہو۔

قدسیہ خالہ کی بھی وہ سیوا میں جُٹ گئیں۔ ہر شخص کی بات سے اتفاق کر کے جن بھی اتروائے، بھوت پریت بھی منائے، پیروں کی نیازیں بھی دلوائیں۔ اُن کی بے طرح خاطر کرنے لگیں۔ اس نئی قدسیہ سے انہیں وحشت ہوتی تھی۔ پاگل ہونے کے سوال پر وہ بالکل نیوٹرل تھیں۔ کون جانے پاگل بھی کسی قسم کی روحانی طاقت رکھتے ہوں۔ بال بچوں والی کو تو ہر طرف سے چوکنا رہنا چاہئے، تاکہ کسی زاویے سے کسی قسم کے خطرے کی گنجائش نہ رہے۔ اور جن لوگ تو بڑے ٹیڑھے مزاج کے ہوتے ہیں کہ پاک پروردگار نے انسان ادنیٰ مٹی سے بنایا اور جنوں کو آتش سے۔ آگ بھڑک گئی تو لینے کے دینے پڑجائیں گے۔

یہ تو صاف ظاہر تھا کہ خالہ پر کوئی بھوت پریت نہیں جو انہیں گوا چھالنے کی ترغیب دیتا۔ کوئی نہایت مہذب فیشن ایبل قسم کے بے حد شوقین مزاج پیر مرد کا سایہ معلوم ہوتا تھا۔ قدسیہ خالہ کی ناز برداریاں دیکھ دیکھ کر ایک چچا میاں تھے جو کلستے تھے۔ انہیں بھی اللہ پاک نے دہکتی آگ سے نہ سہی مگر بھوبل سے ضرور بنایا ہوگا۔

"قدسیہ بانو بڑی چینٹ ہو، خوب سارے گھر کو الو بنا رہی ہو۔" چچا

میاں مسکراتے۔ مگر سب جانتے تھے، وہ نہایت ملحد، مرتد اور نابکار قسم کے انسان تھے۔ سب انہیں لعنت ملامت کرتے۔

"حکیم صاحب قبلہ کے تین زناٹے دار جلاب دیئے جائیں، پیر مرد کے چھکے چھوٹ جائیں گے!" وہ کفر بکتے اور نانی بیوی ماتھا کوٹ لیتیں۔

"آگ لگے تیری زبان کو وہ نگوڑی تن بدن کی سُدھ کھو بیٹھی ہے اور تو ہے کہ بکے جاوے ہے۔" وہ قدسیہ خالہ پر بے حد مامتا توڑنے لگی تھیں۔ بات بات پر گلا بھر لاتیں اور نانا میاں کو یاد کرنے لگتیں۔ وہ زندہ ہوتے تو غریب کو تیری میری نہ سننا پڑتی۔ وہ قدسیہ خالہ کے لئے فالسوں کا شربت بنانے لگتیں۔

"ارے ہم ان کے چلتّر خوب سمجھتے ہیں۔ شبیر میاں سے ملنے کا......"

قدسیہ خالہ بال سُلجھاتے سُلجھاتے اُن سے اُلجھ پڑتیں۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتیں۔

"کیا مشتری جان نے جوتیاں مار کے نکال دیا۔" وہ چٹکی بھرتیں۔ سب جانتے تھے کہ چچا میاں رنڈیوں کی کمائی پر عیش کرتے تھے۔

"میرا ذکر چھوڑو...... تم اپنی کہو......"

"قدسیہ بیٹی۔" نانی بیوی انہیں شربت کا گلاس تھما کر ان کا رخ موڑ دیتیں۔ "اس کم ظرف کے منہ نہ لگا کر۔ مواموری کا کیڑا سب کو اپنی طرح سمجھتا ہے۔" نانی بیوی اچانک اس حادثہ کے بعد سے نہایت پُر و قدسیہ

ہو گئی تھیں۔

"صاحبزادی پر کسی نہایت جلالی پیر مرد کا سایہ ہے۔ انہیں حتی الامکان اشتعال نہ دلایا جائے۔" تائی اماں کے لکھنؤ والے مولانا نے فتویٰ دیا تھا۔ حکیم صاحب قبلہ کی بھی ناچیز رائے تھی کہ فی الحال جلاب ملتوی رہیں اس لئے جذبات کو بھڑکانے سے احتراز کیا جائے۔ ورنہ سر پر اور گرمی چڑھے گی۔ مگر کوئی چچا میاں کو کیسے سمجھائے۔ پاگل ہو کر تو قدسیہ خالہ کے عیش ہو گئے۔ روئی کے گالوں پر پالی جانے لگیں۔ بالکل شہزادیوں کی طرح صاف شفاف چادر، کسی پلنگڑی پر نیم دراز سودا اور ذوقؔ کے کلام سے لطف اندوز ہوا کرتیں۔ شبیر حسن میٹھے لہجہ میں شعر پڑھتے۔ وہ انہیں بوکھلانے کے لئے کسی نازک سے شعر کے معنی پوچھ بیٹھتیں۔ وہ پہلے کی طرح آنے لگے تھے اور اگر آنے میں دیر ہو جاتی تو قدسیہ خالہ اٹھک بیٹھک شروع کر دیتیں۔ چچا عام طور پر بدذاتی پر تل جاتے تھے، مگر اس دن تو وہ بڑھتے ہی چلے گئے۔ قدسیہ خالہ نے شربت کا گلاس ہونٹوں سے لگایا مگر گھونٹ نہ بھرا۔

"عجیب مخنچو ہیں یہ تمہارے شبیر حسن! ہم ہوتے تو......" انہوں نے ہولے سے ایسے منہ ہی منہ میں کہا کہ نانی بیوی نہ سن پائیں۔

"تم ہوتے تو؟" قدسیہ خالہ نے دانت پیسے۔

"لے کے بھاگ جاتے۔" چچا میاں نے لمبی چوڑی انگڑائی لے کے ہاتھ پھیلائے۔

"کمینے، مجھے بھی کیا اپنی مشتری جان سمجھا ہے۔" قدسیہ خالہ ننگی تلوار بن گئیں۔

"ہر عورت میں کہیں نہ کہیں مشتری جان چھپی ہوتی ہے اور موقع پاکر......"

قدسیہ خالہ نے شربت کا بھرا گلاس چچا کے منہ پر کھینچ مارا اور پیر سے ننھی سی سلیم شاہی جوتی گھسیٹ اُن پر ٹوٹ پڑیں۔

اگر ہوش کھو کر یوں دونوں جہان کی بادشاہی مل جائے تو کون کمبخت ہوش میں آنا چاہے گا۔ پہلے اگر یہی قدسیہ بانو اونچی آواز سے بولتیں تو سب نام دھرنے لگتے۔ آج وہ چھ فٹ تین انچ کے دیو ہیکل مردوے کی جوتی کاری کر رہی تھیں۔ ایک سانس میں سو گالیاں دے رہی تھیں اور سب منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے تھے، بلکہ عش عش کر رہے تھے۔

"ارے، ارے نیک بخت، میں تو مذاق کر رہا تھا۔" دونوں ہاتھوں سے وہ وار روک رہے تھے۔ وہ چچا میاں جنہوں نے صدیق پہلوان کو مشتری جان کے پیچھے اٹھا کر چھ فٹ اونچی دیوار کے پار پھینک دیا تھا۔ جیسے صدیق ہاتھی کا بچہ نہیں پھولوں کی گیند تھا۔ وہ قدسیہ خالہ سے پٹ رہے تھے۔ اس دن تو ہم سب بھی قائل ہو گئے۔ یہ دھان پان سی بٹکنا سی قدسیہ خالہ پہلوانی کے ہاتھ نہیں دکھا رہی تھیں۔ یہ تو وہ حسن تھا جو اُن پر عاشق تھا۔

اور جس پر حسن مرتے ہوں اس سے کون الجھے؟

ایک لق دق کوٹھی میں ہر کونہ ایک جدا صوبہ کی طرح بے تعلق

ہو جاتا ہے۔ عرس کا زمانہ قریب آرہا تھا۔ تیج تہوار کے علاوہ مہمانوں کے آنے کا یہ بھی ایک حیلہ تھا۔ مہینوں پہلے سے دور دراز کے جان پہچان اور رشتہ دار آنے شروع ہو جاتے۔ کوئی الگ کمرے غسل خانے تو دیئے نہیں جاتے کہ کچھ فرق پڑے۔ بس چارپائیں، کھٹولے، تخت اور بچھا دیئے جاتے۔ دستر خوان لمبا کر دیا جاتا۔ ایک رکابی میں دو دو کھانے لگتے۔ قطعی کوئی تکلیف نہیں ہوتی، بس بھرے بازار کا سا ہلڑ مچا رہتا جس میں بڑا مزہ آتا۔ ننھیال ددھیال کے دو کیمپ حسبِ ضرورت چھوٹے گروہوں میں بٹ جاتے۔ عجب سماں ہوتا۔ دادی اماں کی طرف زیادہ بُڑھیاں سمٹ آتیں۔ جن کے سامنے ہلو بھی تو اختلاج کے دورے پڑ جائیں۔ نانی بیوی کے ہاں عموماً اماں کی ہم عمر، پھکڑ، ہنسوڑ اور دنیا دار قسم کی بیویاں جمع ہو جاتیں۔ وہ جن کے دودھ پیتے بچے اور شوہر ساتھ ہوتے، بالکل الگ تھلک دو دو پلنگ ڈال لیتے۔ نوعمر لڑکیاں بالکل دوسری سمت ایک ایک پلنگ پہ دو دو سوتیں۔ باقی وقت ایک ریوڑ کی صورت میں کاناپھوسی کیا کرتیں۔

بچے، مرغیاں، کبوتر اور کتے بیچ صحن میں پیڑوں کے نیچے کھڈے پلنگوں اور چوکوں پر دُند مچایا کرتے۔ ایک کونے میں کوئی حادثہ ہوتا تو عوام کو خبر ہوتے ہوتے کچھ وقفہ لگ جاتا۔

اس لئے چچا کی جوتے کاری کے بہت کم چشم دید گواہ تھے۔ جب تک بیویاں جوتے پہن کر پائنچے سنبھالتی آئیں آئیں بجلی کی سرعت سے ہونے والے حادثات کا نام و نشان بھی نہ ملتا تھا۔ جب سب جمع ہوئے تو

قدسیہ خالہ دوپٹہ سے منہ چھپائے پھنکار رہی تھیں اور چچا میاں سرپٹ دروازہ کی طرف ہنستے ہوئے جا رہے تھے۔ جیسے انہیں جوتیاں نہیں بالو شاہیاں مل گئی ہوں!

"اے لڑکیو! کیا ہو رہا ہے۔ بھئی ہمیں تو کوئی بتائے ہی نہیں ہے!" دادی اماں کراہیں۔ ان کے ساتھ کی تمام تھکی ہوئی بڑھیوں نے کروٹ بدل لئے اور پھر اونگھنے لگیں۔

"کیا ہوا، کیا بات ہوئی؟" سب ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ بدبودار پٹھانی اور اوپر کے کام کے چھوکرے میں ہاتھا پائی ہوئی تھی یا سانپ نکل آیا تھا۔

"کس نے مارا، کسے مارا؟" سب پھر ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ بچوں والیاں اپنے بچے گن رہی تھیں۔ اماں سب باتوں سے بے نیاز پائنچے اُڑس کے ابا کی ٹم ٹم کی گھنٹی کی آواز پر پیا ملن کے لئے جا رہی تھیں۔

"اے ہوتا کیا؟ میرا سر!" نانی بیوی چشم دید گواہوں میں ہوتے ہوئے بھی پراسرار بن رہی تھیں۔ "اُن کے منہ جو لگے گا وہ بھگتے گا۔" "اُن،" سے مراد قدسیہ بیگم ہر گز نہ ہوں گی۔ وہ غریب دھان پان! نگوڑی میں دم ہی کہاں تھا! ساری کرامات پیر مرد کی تھی۔

بڑی اداس سی شام تھی۔ آسمان پر باریک سی گرد و غبار کی چادر تنی ہوئی تھی۔ ابابیلیں قینچیوں کی طرح ہوا کو کترتی ہوئی سپاٹے بھر رہی تھیں۔ عرس میں شرکت کرنے والے قوالوں کی ٹولیاں آنے لگی تھیں۔ لمبے چوڑے شامیانے کی دن بھر مرمّت ہوا کرتی۔ درگاہ تازہ قلعی کے بعد سفید براق ہو جاتی تھی۔ جیسے کسی نے بہت سا سفید مارکین کھول کے اونچا نیچا ڈال دیا ہو۔ ان دنوں ہم گھر کو بھول کر درگاہ کے ہو رہتے تھے۔ وعظ سے ہمیں رونا آنے لگتا تھا مگر قوالی میں خوب مزہ آتا۔

سراجاً منیرہ نگارِ مدینہ
تجلیٰ مکہ بہارِ مدینہ

مطلب خاک پلے نہ پڑتا۔ مکہ مدینہ کے ذکر سے ہم مرعوب ہو جاتے۔ پھر کسی اللہ والے کو حال آجاتا اور خوب اُودھم مچتی۔ قوال ایک ہی شعر پر اٹک جاتے اور وہی دہرائے جاتے۔ یہاں تک کہ بور ہو کر حال کھیلنے والا ست پڑ جاتا۔ اور قوال نیا قطعہ شروع کرتے۔

"کیا ہوا لوگو! ہمیں بھی تو بتاؤ۔" ہم اندر آئے تو دادی اماں منمنا رہی تھیں۔ بُوا کی پچمارن سب کے پیر پڑتی پھر رہی تھی۔

"ارے کوئی چل کے دیکھو رام جانے اُو کا کا ہوئی گوا۔"

"ہے، ہے کیسے؟"

"کیا ہو گیا؟" سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ اور جب معلوم ہوا کہ بُوا کو تین چار دن سے بخار تھا۔ کل رات کو نہ جانے کب نکل کھڑی ہوئیں۔ صبح قبرستان میں اوندھی پڑی ملیں، تب سے گھانٹی چل رہی ہے۔

"ہے، ہے نِگوڑی!" بیویاں افسوس کرنے لگیں۔ پھر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئیں۔

"ہم پوچھیں تو کوئی بتائے نہیں ہے۔ کتا ہیں کہ بھونکے جاویں ہیں۔ کیا مجال جو کوئی کان دھرے۔" دادی اماں نے تکیہ تلے سے سجدہ گاہ نکالی اور نیت باندھ لی۔ نانی بیوی ان کے نیت باندھنے کے انداز پر توبہ توبہ کرتی تھیں۔ سجدہ پر بھی اعتراض تھا۔ جیسے مینڈکی ڈبکیاں کھا رہی ہو۔

ایک قدسیہ خالہ تھیں، بے کل ہو رہی تھیں۔ ہڑبڑائی ہوئی اِدھر سے اُدھر جا رہی تھیں۔

"اے ہے کوئی ڈاکٹر سے جا کے کہو۔" درگاہ کے ہسپتال کا ڈاکٹر مفت علاج کرتا تھا۔ کسی کو قدسیہ خالہ کی بلبلاہٹ پر تعجب نہ ہوا مگر "ان کا" حکم ٹالنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

رات بھر بُوا کی گھانٹی چلتی رہی۔ ڈاکٹر نے کہا ڈبل نمونیہ ہے۔ صبح ہم لوگ بھی دور سے اُنہیں دیکھنے گئے۔ عیادت کو نہیں، یونہی۔ بُوا

جھلنگے میں پڑی ایڑیاں رگڑ رہی تھیں۔ وہ بدبو تھی کہ ناک نہیں دی جاتی تھی۔ تیسرے دن کہیں جا کے گھانٹی کی گھر گھراہٹ بند ہوئی۔

اللہ، توبہ توبہ۔ سفید کفن میں اینٹھی ہوئی بُوا کس قدر ڈراؤنی لگ رہی تھیں۔ کس غضب کی نامرادی اور پھٹکار تھی چہرے پر۔ ادھ کھلی گھومی ہوئی آنکھیں، اودا اودا رنگ، منھ اور ناک سے گلابی گلابی پانی رِس رہا تھا۔ برسوں رات کو خواب میں آ کے ڈراتی رہیں۔ اندھیرے میں جاتے دم نکلتا کہ بُوا نہ کھا جائیں۔ جھٹ پٹا ہوتے ہی دم فنا ہونے لگتے۔ کلیاں چننے جانے کی ہمت نہ ہوتی۔ معلوم ہوتا مسجد کے پچھواڑے بیٹھی ہیں۔ برگد کے نیچے کھڑی سلیپر میں سے ریت جھاڑ رہی ہیں۔ اور ابھی اُدھر سے ڈھول بجاتی ”میرٹھ میں ملیں گے دونوں جنے“ گاتی آ جائیں گی۔

بالے میاں سے بہت روٹھا کرتی تھیں، مگر جب وہ روٹھے تو جگ سے منھ موڑ لیا۔ بُوا کی یہ گت ہوئی اور انہوں نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ ہائے نگوڑی بُوا۔ لوگ خواب دیکھنے پر بھی پہرا بٹھا دیتے ہیں۔ جینے کا کوئی سہارا ہوا، دنیا کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے گا۔

سارے گھر پر بُوا کی موت کی ہیبت بیٹھ گئی۔ سب ہی کے ہاتھوں پر ان کے معصوم خون کے دھبے تھے۔ گھر کو بلاؤں سے پاک رکھنے کے لئے فوراً دو ملّانے ڈیوڑھی پر بٹھا دیئے گئے۔ صبح شام ہل ہل کے سی پارے پڑھا کرتے تھے اور بھر بھر سینیاں روٹی ٹھونستے!

بُوا کی موت نے قدسیہ خالہ کے پیر اکھاڑ دیئے۔ دو دن تک اُن

کے منہ میں کھیل تک اڑ کے نہ گئی۔ رات رات بھر دیوانگی کے عالم میں چکر کاٹتیں۔ اندھیرے آنگن میں خاموش سر جھکائے فرش کو گھورا کرتیں۔ جیسے اس میں کوئی سیند ڈھونڈ رہی ہوں کہ پا جائیں تو وہیں سما جائیں۔ پیاسی چڑیا جیسی آنکھیں پھاڑے اپنے چاروں طرف مڑ مڑ کر دیکھتی ہیں کہ کوئی خوں آشام درندہ جست مار کر گلا نہ دبوچ ڈالے۔ ہر طرف موت منڈلاتی نظر آتی۔ نانی بیوی شربت بنا کے دیتیں۔ یہ چپکے سے آنکھ بچا کے اگالدان میں انڈیل دیتیں۔ پان مٹھی میں دبا کر جھوٹ موٹ منہ چلانے لگتیں، پھر جا کے پاخانے میں پھینک آتیں۔ صرف اماں کی رکابی سے نوالہ لیتیں۔ انہیں کسی پر بھروسہ نہ رہا تھا۔

اس شام شبیر ماموں آئے۔ گھڑی بھر اِدھر اُدھر چوروں کی طرح دیکھتے رہے۔ بغیر آنکھیں ملائے دیوانِ غالب کی جلد قدسیہ خالہ کو دی۔ دادی اماں کو سلام کیا پھر اٹھ کر بغیر قدسیہ خالہ پر نظر ڈالے چلے گئے۔

قدسیہ خالہ دونوں ہاتھوں سے کتاب دبوچے ایسے بیٹھی تھیں کہ اگر کھل گئی تو اژدہا نکل کے انہیں ڈکار جائے گا۔ نانی بیوی ان کا بستر ٹھیک کر رہی تھیں۔ بڑے پیار سے تکیہ پر پھول سجا کر انہوں نے دُلائی تہہ کر دی۔

"لو بیٹی ذرا آ کے لیٹ رہو۔ تمہارا کھانا اِدھر ہی لے آؤں گی۔ اُدھر تو خوگیر کی بھرتی بھری ہوئی ہے۔" انہوں نے برآمدے میں لگے طویل دسترخوان کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے اماں بی۔" انہوں نے کتاب تکیہ کے نیچے

رکھ دی۔

"کیوں بیٹی۔ دوپہر کو بھی منہ جھٹال کے اٹھ گئیں۔ اور۔"
حالاں کہ انہیں گمان بھی نہیں تھا کہ بیٹی اُن پر شک کرتی ہے۔ آخر کو ماں تھیں۔ اکلوتی بچی پر ہمیشہ ہی جان جاتی تھی۔ اپنی دانست میں وہ جو کچھ کرتی تھیں اس کی بھلائی کے لئے کرتی تھیں۔

ایک دم قدسیہ خالہ کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ چچا میاں جھک کر کتاب اٹھا رہے تھے۔

قدسیہ خالہ پر جاڑا بخار کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ایک ننھا سا کاغذ کا پرزہ ہوا میں لرزتا ہوا قدسیہ خالہ کے قدموں میں گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھاتیں چچا میاں نے پیر رکھ دیا۔ جھک کر اٹھایا اور بغیر کھولے الٹ پلٹ کے دیکھا اور نانی بیوی کی طرف بڑھا دیا۔ قدسیہ خالہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

"کیا ہے؟" انہوں نے پرچہ لے کے دیکھا پھر پھینک دیا۔ "چل ہٹ۔" نانی بیوی کبڈ تھیں۔ ایک حرف نہ پڑھ پاتی تھیں۔

"ارے، ارے تعویذ ہے بے ادبی نہ کرو۔" انہوں نے پرچہ اٹھا کے قدسیہ خالہ کے تکیہ پر رکھ دیا۔

"کیسا تعویذ؟" وہ ایک دم مؤدب ہو گئیں۔

"بھوت اتارنے کا۔"

"اونھ! بھئی میں تمہارے ساتھ کی کھیلی تو ہوں نہیں کہ لگے مذاق کرنے۔" نانی بیوی بگڑ کر چلی گئیں۔

"ساتھ کے کھیلے کب گنتی میں لاتے ہیں۔" وہ دبی زبان سے کہتے دادی اماں کے برآمدے میں چلے گئے۔

"اماں بیگم! فتح پور والی زمین میرے نام کردو نہیں تو امام حسین کی قسم سُنّی ہو جاؤں گا۔"

"مُوار کابی مذہب!" نانی بیوی بڑبڑائیں۔

"آمیٹھی والے آموں کے باغ میرے نام جلد کردو تو ابھی سُنّی ہوا جاتا ہوں۔" وہ نانی بیوی سے الجھتے۔

"اوئی! وہ تو قدسیہ کے نام ہیں۔"

"کوئی مضائقہ نہیں، قدسیہ کو بھی ہبہ کردو میں سب سے سمجھ لوں گا!"

"تیرے منہ میں خاک!" نانی بیوی جوتی سنبھالتیں اور وہ ممانی کو جلانے لگتے۔

"بھابی یہ کڑے دے دو تو تمہاری ساری سوتوں کی ناک چوٹی کاٹ کے تمہارے قدموں میں رکھ دوں۔" مگر کوئی انہیں کچھ نہ دیتا کہ وہ اپنی ساری جائید ادرنڈیوں میں پھونک چکے تھے۔

تہجد کی نماز پڑھنے نانی بیوی اٹھیں تو تیمم کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ جہاں کے تہاں معلق رہ گئے۔ قدسیہ خالہ کی پلنگڑی خالی پڑی تھی۔ تکیہ کے پھول جوں کے توں مہک رہے تھے ایک پتی نہ مسلی تھی۔ صدر دروازہ بھاڑ کی طرح کھلا تھا۔ کنڈی ابھی تک ہل رہی تھی۔

نانی بیوی کی چیخیں سن کر جگار ہو گئی۔ وہ کونے کونے میں قدسیہ کو پکارتی پھر رہی تھیں۔ ذرا ہوش ٹھکانے ہوئے تو لالٹین لے کر لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔

”ارے یہ کیا ہو رہا ہے ہمیں نہ بتاؤ گے لوگو!“ دادی اماں گھگیا کر سب کو بوکھلا رہی تھیں۔ نانی بیوی کو اماں چھوٹی سی بچی کی طرح کندھے سے لگائے دلاسا دے رہی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ مختلف کونوں سے پوچھا جا رہا تھا۔ بچے ٹھنکنے لگے۔ مرغیاں کڑکڑانے لگیں!

”اے ہے شاید ڈربہ کھلا رہ گیا۔“ نیند میں تائی اماں سمجھیں بلی مرغی لے گئی۔

قدسیہ خالہ کے چھوٹے چھوٹے برہنہ پیروں کے نشان باؤلی کی

بینڈ تک تو ملے پھر ختم ہو گئے۔ دائیں طرف اسٹیشن جانے والی پگڈنڈی پر سینکڑوں مویشیوں اور انسانوں کے نقشِ قدم نظر آئے مگر ان میں قدسیہ خالہ کے ننھے ننھے سفید پیروں کا ایک بھی نشان نہ تھا۔ باؤلی کی تہہ لے ڈالی مگر قدسیہ خالہ کی لاش نہ ملی۔ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا!

"جنتی بیوی تھی میری بچی۔" تیجے کے دن نانی بیوی نے رو رو کر براحال کر لیا۔

"کیوں روتی ہیں۔ وہ جہاں گئی ہے اللہ اسے غریقِ رحمت کرے۔" چچا نے سوکھے آنسو پوچھے۔ کس قدر ذلیل تھے ہمارے چچا میاں!

"آمین!" نانی بیوی نے بدبد درود شروع کیا۔

کچھ دن بعد ان کے لئے عجیب عجیب قصے مشہور ہونا شروع ہوئے۔ کہ جب وہ باؤلی میں کود پڑیں تو چھن سے تہہ میں ایک کھڑکی کھلی۔ کیا دیکھتی ہیں لق و دق میدان ہے، ہو کا عالم، آدم نہ آدم زاد، سامنے سے غبار اٹھتا نظر آیا۔ جب دھند چھٹا تو کیا دیکھتی ہیں کہ ایک تختِ زریں ہے کہ زرنگار تکیوں سے آراستہ ہے۔ چار پریاں تخت کے چاروں کھونٹ سنبھالے ادب سے سر جھکائے کھڑی ہیں۔ انہیں تخت پر بٹھایا گیا اور آسمان کی طرف اُڑ گیا۔

یہ قصے چچا میاں گڑھ گڑھ کے سنایا کرتے تھے۔ کچھ بدمذاق لوگ یہ بھی کہتے تھے، وہ شبیر ماموں کے ساتھ بھاگ گئیں۔ کچھ بھی ہو قدسیہ خالہ کا نام لینا اُس دن سے گناہ ہو گیا۔ جب تک نانی بیوی زندہ رہیں ان کے

ڈر سے کوئی ذکر نہ کرتا۔ پھر سب بھول بھال گئے۔
کہ بھول جانے میں بڑے فائدے ہیں۔ ضمیر ملامت نہیں کرتا!

کوئی دو ڈھائی مہینے ہوئے ایک ٹیلی فون آیا۔
"میں رفیعہ حسن بول رہی ہوں۔ وکٹوریہ ٹرمینس کے مسافر خانے سے بول رہی ہوں۔ صبح کے پلین سے لندن جارہی ہوں، کچھ وقت دے سکیں تو......" وہ پی ایچ ڈی کرنے جارہی تھی۔ بڑی آلکس آئی۔ کوئی ادب نواز ہوگی۔ خواہ مخواہ وہی گھسے پٹے جملے دہرا کر جی جلائے گی۔ بڑے ادیب نئی پود کو ابھرنے نہیں دیتے۔ گٹھ بنائے بیٹھے ہیں۔ بس ایک دوسرے کو اچھالتے ہیں۔ مجھے موقع پرست اور جانب دار ثابت کرے گی۔
"دراصل......" میں کوئی اَن گڑھ سا بہانا سوچنے لگی۔
"میں زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ بس دس منٹ کافی ہوں گے۔"
وہ بڑی ہوشیار معلوم ہوتی تھی۔
وہ آئی تو بڑے پیار سے مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اسے دیکھ کر آپ ہی آپ جی ہلکا ہوگیا۔
"آپ کا پتہ بڑی مشکل سے ہاتھ آیا۔ آپ کو تو شاید یاد نہ ہو۔

آپ میری رشتہ کی بہن لگتی ہیں۔ میری امّی قدسیہ شبیر حسن آپ کی خالہ ہوتی ہیں۔"

"قدسیہ خالہ۔ تم قدسیہ خالہ اور شبیر ماموں کی لڑکی ہو۔" میں احمقوں کی طرح ہکلانے لگی۔ "میرٹھ میں ملیں گے دونوں جنے!" بُوا کی رسیلی آواز میری یادداشت کے پٹ جھنجھوڑنے لگی۔ تو دونوں مل ہی گئے۔ بعض انسان مر کے دوسروں کو جینے کا سلیقہ سکھا جاتے ہیں!

"اور عین وقت پر امّی کی ہمّت جواب دے گئی۔ ابو سے لڑ پڑیں کہ مجھے گمراہ کر کے گناہگار کر رہے ہو۔ مگر مستقیم ماموں......"

"مچھو چچا میاں!" جنت تو کیا نصیب ہو گی مرحوم کو مگر خیر اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔

"امّی کی تو انہیں دیکھ کر جان ہی نکل گئی۔ وہ تو باؤلی میں کود کر جان دیئے دے رہی تھیں، مگر مچھو ماموں نے کہا۔ یہ جوتے چھوڑ کر ننگے پیر آ گئیں۔ یہ تو پہنتی جاؤ۔ نہیں تو پاؤں بھیگ گئے تو زکام ہو جائے گا۔"

"چچا میاں نے کہا؟"

"ہاں اور جیب سے امّی کی جوتیاں نکال کے دیں۔ مگر امّی بکھری جاتی تھیں کہ مجھے مر جانے دو۔"

"مگر ان کے پیروں کے نشان؟"

"وہ کیسے ملتے ابّو نے انہیں اٹھا لیا۔" وہ ہنس پڑی۔ "اب تو امّی اتنی موٹی ہو گئی ہیں کہ سوچ کر ہنسی آتی ہے۔ وہاں سے پیدل اسٹیشن گئے۔"

"اور وہاں سے میرٹھ!" بوا کی یاد بہت ستانے لگی۔

"میرٹھ؟ نہیں تو۔ وہاں سے اپنے دوست کے ہاں ردولی گئے۔"

"ردولی؟ میاں کی سسرال؟ خوب!"

"کس کی سسرال؟" وہ چکرائی۔

"پھر؟" میں نے بات ٹالی۔

"ان کے دوست ابرار چچا وکیل تھے۔ طلاق لینے کی بہت کوشش کی۔"

"مرتے مر جاؤں گا مگر طلاق نہیں دوں گا۔" وہ کہا کرتے تھے۔

"جی ہاں۔۔۔ اور ستم ظریفی تو دیکھئے، مرے بھی نہیں۔"

"کیا فرق پڑا؟ وہ زندہ ہی کب تھے۔"

"واقعی کوئی فرق نہیں پڑا۔"

جب طلاق کی کوئی صورت نہ نظر آئی تو شبیر ماموں کے دوست نے رائے دی کہ اگر قدسیہ عیسائی ہو جائیں تو طلاق ہو سکتی ہے۔ کانپور کے ایک پادری سے رجوع کیا گیا۔ مگر جب اسے تبدیلیٔ مذہب کی وجہ بتائی تو بہت برافروختہ ہوا۔ نیز یہ کہ اگر پھر دوبارہ اسلام اختیار کیا تو طلاق باطل ہو جائے گی۔

مچھو ماموں کو جب اس ہیر پھیر کی خبر ملی تو آکر بہت دُند مچایا۔ سب کو قتل کر کے قدسیہ کو لے بھاگنے کی دھمکیاں دیں۔ شبیر ماموں کی مرمت کرنے کی دھمکیاں دیں۔ اسی شام ایک قاضی کو لا کر نکاح کر دیا۔

"یہ نکاح نہیں ہوا۔" شبیر حسن کے دوست ابرار نے کہا۔ وہ وکیل تھے۔

"ہوا کیسے نہیں۔" وہ ابرار چچا کی گردن توڑنے پر مصر تھے۔

اگر قدسیہ خالہ کے شوہر کو پتہ چل جاتا تو وہ دونوں کو حرام کاری کے جرم میں دھر لیتے۔

قدسیہ خالہ اور شبیر ماموں ساری عمر چوروں کی طرح چھپتے رہے۔ معمولی سے عام انسان ویسے ہی گم نام رہتے ہیں۔ پھر بھی خوف تو رہتا تھا۔ حالانکہ چچا میاں نے انہیں یقین دلا رکھا تھا کہ اگر اس نے کچھ گڑ بڑ کی تو اُس کا قصہ ہی پاک کر دیں گے۔

"اور خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔" قدسیہ خالہ کہا کرتی تھیں۔

"وہاں تم پچھاڑ کھا کے ایک کونے میں بے ہوش ہو جانا۔ میں سب سمجھ لوں گا۔" چچا تسلی دیتے۔

"پھر جب طلاق بل پاس ہوا تو وہ برٹش نیشنلٹی لے کر انگلستان جا بسے تھے۔ دوسرے میں سیانی ہو چکی تھی۔ پھر نئے سرے سے ہنگامہ کھڑا کرنے کی ضرورت نہ محسوس ہوئی۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "امی اور ابو کی محبت کو دیکھ کر شادی بیاہ اور طلاق کی اہمیت پر ہنسی آنے لگتی ہے، شاید اس لئے کہ میں نورمل نہیں۔"

"یہ کیسے جانا کہ تم نورمل نہیں!"

"میں سمجھتی ہوں کہ جو امّی اور ابو نے کیا وہی کرنا چاہئے تھا۔ یہ

میری خوش قسمتی ہے کہ میں ان کی محبّت کا پھل ہوں۔"

وہ صرف دس منٹ کے لئے آئی تھی، مگر نہ مجھے رخصت کرنے کا خیال آیا اور نہ اُسے جانے کا۔ چند گھنٹے پہلے مجھے اس کے وجود کا بھی یقین نہیں تھا۔ وہ میرے لئے ایک اجنبی تھی۔ کھانے کے بعد ہم بہت رات تک دو بچوں کی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے میرین ڈرائیو کے کنارے ٹہلتے رہے۔ ایک مہکتا ہوا پھول تھا جو ہمارے درمیان کھلتا رہا، پروان چڑھتا رہا۔

"ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔" ہم دونوں ایک ہی بات محسوس کر رہے تھے۔

"کبھی زندگی کا ایک لمحہ صدیوں پر بھاری پڑ جاتا ہے۔"

"امّی کو اتنا دکھ کس بات کی سزا کے طور پر ملا؟" تھوڑی دیر خاموشی رہی۔

"اور بُوا کو بالے میاں سے کیوں جدا کر دیا؟"

"کسی کے خواب چھین کر انہیں کچلنے میں کیا ملتا ہے؟"

"کیونکہ اُس کی اپنی بانجھ دنیا میں خواب نہیں ہوتے۔"

"اِس لئے وہ دوسروں کا خون کرتا ہے؟ کیوں؟"

"احساسِ کمتری سے پیچھا چھڑانے کے لئے وہ چیخ چیخ کر کہتا ہے۔ میرا ملک عظیم ہے۔ میرا مذہب سب سے ارفع ہے۔ میرا شہر...... میرا گھر...... میری دنیا زیادہ بلند ہے، زیادہ مقدس ہے۔ میرا شعور، میرا یقین،

میر اطریقۂ فکر صحیح ہے۔"

"مگر زبردستی۔"

"ہاں زبردستی۔ وہ جو خیال اور عمل کی آزادی کو ہر انسان کا حق سمجھتے ہیں، ڈیموکریسی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، تلوار کے زور سے ڈیموکریسی حلق میں ٹھونسنے لگتے ہیں۔ کبھی خدا کا حکم کہہ کر، کبھی کسی اصول یا جذبہ کی آڑ لے کر اور کبھی رسم ورواج کے بہانے۔ اور کچھ نہ ملے تو بھوت پریت کے سر الزام تھوپ دیتے ہیں۔"

صبح جب میں اسے ایرپورٹ پر بدا کرنے گئی تو ہوائی جہاز میں داخل ہونے سے پہلے وہ بڑی دیر تک مجھ سے خاموش لپٹی کھڑی رہی۔ جیسے وہ کوئی پیغام میرے جسم میں چھوڑ جانا چاہتی ہے۔

"بس ایک دعا ہے۔" اس نے اناؤنسر کی آواز پر مڑتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" مسافروں کی قطار ہوائی جہاز کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

"کہ ہمیں بھی کوئی ایسی لگن سے چاہے جیسے ابو نے امّی کو چاہا۔ اور......" اُس نے تکلف سے آنکھیں نیچے گرادیں۔

"اور......؟" میں نے اسے آخری پھاٹک کی سیڑھیوں پر روک کر پوچھا۔ یہ چلی گئی تو میں یہ ادھوری بات کی خلش لئے رہ جاؤں گی۔

"جیسے مچھو ماموں نے محبت نباہی۔"

"مچھو چچا میاں؟ مستقیم چچا، وہ ٹیڑھے میڑھے مستقیم! زمانے بھر

کے رنڈی باز، خدائی خوار، شرابی لچے، جو خاندان کی دمکتی ہوئی بلند پیشانی پر گھناؤنا پھوڑا تھے۔ جنہیں کسی خاندانی لڑکی نے اپنا میلا آنچل تک نہ چھونے دیا۔ انہوں نے قدسیہ خالہ کو چاہا...... ایسے کہ آج قدسیہ کی بیٹی اُن جیسے محبوب کا ارمان دل میں بسائے ہوئے ہے۔"

"مگر وہ جانتے تھے کہ ابو کے سوا امّی کسی اور کو گنتی میں نہیں لاتیں۔ ابو بے چارے تو پھُس پھُسے تھے۔" وہ زور سے ہنسی۔ "ساری اسکیم مچھّو ماموں کی تھی۔"

وہ چلی گئی۔ ایک دم بڑا سخت تنہائی کا احساس چاروں طرف سے گھیرنے لگا۔

"مچھّو چچا!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "سنا تم نے؟ اِس وقت تمہاری قبر میں جگنو جگمگا رہے ہوں گے۔"

انسان ایک دوسرے کو پہچاننے کا گر کب سیکھیں گے؟

جہاز ایک بدمزاج دیو کی طرح لرزا، گرجا اور آسمان کی بلندیوں کی طرف اُڑ گیا۔

"جاؤ رفیعہ حسن، تم بے دھڑک جہاں چاہو جاسکتی ہو۔ زندگی کی قدروں کو ناپنے تولنے کے لئے تمہارا فیتہ ہے، اپنے باٹ ہیں...... اپنی ترازو ہے۔ تمہاری زندگی میں کوئی ڈنڈی نہ مار سکے گا...... تمہارے خواب کبھی چکنا چور نہ ہوں گے!"

سعادت حسن منٹو

اردو کا بہت بڑا افسانہ نگار

سعادت حسن منٹو کو زندگی کم ملی اور بڑی جھیلنے والی زندگی...... پر وہ ساری عمر اس سے کھیلتا، اسے چڑاتا رہا...... اور کم وقت ملنے کے باوجود بہت سی عمروں سے بڑا تخلیقی سرمایہ ہماری نذر کر گیا...... اسے مرے ہوئے اب چوالیس سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا ہے...... ان چوالیس سالوں میں اردو کے کتنے قد آور افسانہ نگار پرانے ہوگئے، مگر منٹو، آج بھی نیا ہے، آج بھی تازہ، آج بھی زندہ......!

بار بار پڑھے جانے پر بھی وہ اپنی افادیت اور اہمیت نہیں کھوتا بلکہ اس کی سرکشی اور سرکشیدگی پہلے سے کچھ سوا ہی نظر آتی ہے...... اردو کے اس سب سے بڑے، سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ بدنام مصنف کی عرصۂ دراز سے نایاب کتابوں کے نئے ایڈیشن ساقی بک ڈپو نے شائع کئے ہیں۔

منٹو کے مضامین	=/75	خالی بوتلیں خالی ڈبے	=/40
بانجھ	=/75	شکاری عورتیں	=/20
اوپر نیچے اور درمیان	=/60	گنجے فرشتے	=/50
افسانے اور ڈرامے	=/35	سرکنڈوں کے پیچھے	=/30
آتش پارے اور سیاہ حاشیے	=/45	نمرود کی خدائی	=/20
ٹھنڈا گوشت	=/50	کالی شلوار	=/35

معیاری مطبوعات